

حیات سعدی

خواجہ الطاف حسین حالی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
بہ اشتراک
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

Hayat-e-Saadi

By

Khuwaja Altaf Husain Hali

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنا اشاعت : جولائی، ستمبر 2004، شک 1924

قومی اردو کونسل کا پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : 96/-

سلسلہ مطبوعات : 1173

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 66

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اس نے مختلف اقدام کیے ہیں جن میں کمپیوٹر اپلیکیشن، ملٹی ٹکنول ڈی۔ٹی۔پی۔، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن اور اردو رسم الخط میں سرٹیفیکٹ کورس شامل ہیں۔ ان اقدامات کے ذریعے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اردو تعلیم کے منظر نامے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کوشش کو بڑی حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابوں کی طباعت اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اس لیے اردو زبان کا وہ کلاسیکی سرمایہ جو دھیرے دھیرے نایاب ہوتا جا رہا ہے، قومی اردو کونسل نے اس کی مکرر اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے کارہائے نمایاں میں سے ایک اہم کام ان اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کی اشاعت ہے جن کا شمار اردو کے کلاسیکی سرمائے میں ہوتا ہے۔ ان کتب کی اردو شائقین کے حلقوں میں جس قدر پذیرائی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لیے اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی تمام مطبوعات کو ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل ایک مشترکہ معاہدے کے تحت ازسرنو شائع کرے گی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر

حیاتِ سعدی

فہرست

| صفحہ | نمبر شمار | صفحہ | نمبر شمار |
|------|--------------------------------|------|-----------------------------------|
| 71 | گلستان اور خارستان کا مقابلہ | 5 | 1- دیباچہ |
| 74 | گلستان اور پریشان کا مقابلہ | 9 | 2- پہلا باب (شیخ کی سوانح عمری) |
| 122 | غزلیاتِ شیخ | 9 | فارس اور شیراز کا حال |
| 140 | قصائد وغیرہ | 12 | شیخ کا نام، نسب، ولادت اور بچپن |
| 147 | مدح و موعظہ محمد الدین رومی | 13 | شیخ کی تعلیم کا حال |
| 150 | صاحبیہ | 24 | شیخ کی سیاحت کا حال |
| 154 | رباعیات | 30 | شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا |
| 161 | مفردات | | |
| 164 | مطابقات و ہزلیات و مضحکات | 45 | 3- دوسرا باب (شیخ کی تصنیفات) |
| 168 | عربی قصائد اور مقلعات | 45 | شیخ کی شاعری کی شہرت اُس کی |
| 175 | 4- خاتمہ | | زندگی میں |
| | شیخ کے عام حالات اور اس کی عام | 48 | شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں |
| | شاعری پر اجمالی نظر | 53 | کلیاتِ شیخ |
| | | 54 | گلستان اور بوستان |
| | | 67 | گلستان اور بہارستان کا مقابلہ |

دیباچہ

مشہور آدمیوں کا حال لکھنا جس کو یونانی میں بیوگرافی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں کم و بیش قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ اُس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن یہودیوں کے ہاں قدما کی سرگذشتیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگرافر پلوٹارک کی بیوگرافی جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی اُس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے۔ اور عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر میں اُس زمانے کے اولیاء، شہدا اور مجتہدوں کی سوانح عمری جو کسی قدر مکمل ہیں کثرت سے موجود ہیں۔ زمانہ متوسط میں مسلمانوں کی بیوگرافی سب سے زیادہ وقعت کے قابل ہے۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں تذکرہ لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے درایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بیوگرافی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی ہے۔ صرف رجال حدیث کے حالات جو محدثین نے لکھے ہیں اُن میں البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم و کاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ بیان کی گئی ہیں۔ باقی علماء اور شعرا وغیرہ کے تذکرے اکثر ایسے نہیں ہیں۔ اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا اس لیے اُن لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں جیسے (خلفاء، سلاطین، وزراء اور سپہ سالار وغیرہ) باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر ہوئے ہیں۔ اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف بھی جداگانہ نہیں لکھی گئی۔ زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ

تاریخ کی طرح بیوگرافی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے۔ حال کی بیوگرافی میں اکثر مؤرخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر خوش کیا جاتا ہے اور اُس کے عیب اور خوبیوں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔

بیوگرافی اُن بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلانی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں اُن کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور اُن کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ لو تھر¹ کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن² فرینکلن نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقی اور شہرت حاصل کی اُس کا بڑا سبب یہی بیوگرافی کا مطالعہ تھا۔ بیوگرافی علمِ اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سود مند ہے۔ کیونکہ علمِ اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگرافی سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ”بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل چا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔“ ہمارے ملک میں بیوگرافی

1۔ لو تھر جرمنی کا رہنے والا عیسائی مذہب کا ایک مشہور مصلح اور تمام یورپ کو پوپ کے چبچے سے نجات دینے والا

ہے 1483ء میں پیدا ہوا اور 1546ء میں فوت ہوا۔

2۔ یہ شخص امریکا کا ایک مشہور قاضی ہے جس نے سب سے اول علمِ برق کے اصول دریافت کیے ہیں 1706ء

میں بمقام بوشن پیدا ہوا اور 1790ء میں فوت ہوا۔

کی طرف اب تک کچھ توجہ نہیں ہوئی۔ ملک کی عام زبان یعنی اُردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں۔ جن کے حالات پڑھ کر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور اُن کے کمالات قوم کے لیے سرمایہ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ اُن کا نام زندہ کرنے اور آئندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُن کے فضائل اور کمالات دنیا میں شائع کریں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قدما میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں اُن کے بھی مفصل حالات دستیاب ہونے سخت دشوار بلکہ ناممکن ہیں صرف تذکروں میں کچھ کچھ مختصر حال درج ہے لیکن اُس سے کسی کی لائف ترتیب وار لکھنی ہرگز ممکن نہیں۔

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے شاید اُن کے مفصل حالات بہم پہنچ جائیں۔ اُن کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں دیکھے اور انگریزی تذکرہ سرگورادسلی¹ صاحب کا بھی دیکھا مگر ان تمام تذکروں میں زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکایتیں جو زبان زد خاص و عام ہیں تھوڑے تھوڑے تفاوت کے ساتھ مندرج پائیں۔ شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اُس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں مایوس کرنے والی تھیں مگر ہم نے اپنے ارادہ کو جس طرح ہوسکا پورا کیا۔ جس قدر صحیح اور معقول باتیں تذکروں سے معلوم ہو سکتی تھیں اُن کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کیے۔ اور نیز اُس عہد کی تاریخ میں اکثر واقعات کا سراغ لگایا اور کچھ باتیں علی بن احمد جامع کلیات شیخ کے دیباچہ سے اخذ کیں۔ اور کچھ کچھ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی۔ اور اس تمام معلومات کو جہاں تک ممکن تھا لائف کی

1۔ یہ صاحب 1878ء میں جب کہ مارکوکس آف وٹری صاحب گورنر جنرل تھے بطریق سیاحت ہندستان میں آئے تھے۔ شدہ شدہ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے ہاں ٹوکر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ کی طرف سے ایران میں سفیر ہو کر گئے۔ سفارت کے زمانے میں ایک تذکرہ ایران کے مشہور شاعروں کا جن میں شیخ بھی شامل ہے انھوں نے بہت کوششوں سے لکھا تھا۔

صورت میں مرتب کیا۔ اور شیخ کی تصنیفات کے بیان میں زیادہ تر اپنی ناچیز رائے اور تعصبات پر بھروسہ کر کے یہ مضمون ختم کیا گیا۔ اگرچہ شیخ کی اصل سرگزشت میں جس قدر کہ وہ اب تک معلوم ہوئی ہے، کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے لیکن جس ترتیب کے ساتھ اُس کے پراگندہ حال جمع کر کے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں اور جس طریقہ سے اُس کی عمدہ تصنیفات اور پاکیزہ خیالات پر بحث کی گئی ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ عام ناظرین کے لیے اس کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اور خاص کر شعرا کو اس سے کسی قدر بصیرت اور نصیحت بھی حاصل ہوگی۔

اس کتاب کے دو باب اور ایک خاتمہ ہے پہلے باب میں شیخ کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں اُس کی تصنیفات کا مفصل ذکر ہے اور خاتمہ میں اُس کے عام حالات اور عام شاعری پر بالا جمال نظر کی گئی ہے۔ اگرچہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندستان میں اُس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اُس کے رتبہ کو نہیں پہنچا۔ لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنفوں کی سوانح عمری اور اُن کی تصنیفات کا بیان جدا جدا لکھیں گے۔

السعی منی و الاتمام من اللہ

پہلا باب

شیخ کی سوانح عمری

شیخ کی سرگزشت بیان کرنے سے پہلے اُس مردم خیز خطہ کا مختصر حال لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا جس کی خاک سے ایسا مفید اور مقبول مصنف پیدا ہوا۔ اور جہاں سے علماء و شعرا اور جلیل القدر مصنفوں کی ایک جماعت کثیر عروج اسلام کے ہر طبقہ اور ہر صدی میں ظہور کرتی رہی ہے۔

فارس اور شیراز کا حال

ایران کے جنوب مغربی حصے میں خلیج فارس کے کنارہ پر پارس¹ ایک خطہ ہے جس کو عرب فارس کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے لیکن اب خاص اس حصے کو پارس کہا جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی ولایت میں بہت سی قدرتی اور قدیم مصنوعی چیزیں ایسی ہیں کہ اُس کو دنیا کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

تقریباً آدھا ملک پہاڑی اور آدھا میدانی ہے۔ اور جنوبی حد پر سمندر یعنی خلیج فارس ہے آب و ہوا نہایت گرم ہے اور کہیں نہایت سرد ہے۔ اکثر صحرا سبز و شاداب ہیں۔ جا بجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں۔ صحراے شاپور میں جو کہ شیراز کے نواح میں ہے ایک وسیع قطعہ ہے جس کا نام شعب بوآن ہے۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چار تفرج گاہیں ایسی

1۔ پارس جیسا کہ فرہنگ نامصری میں لکھا ہے ہوشک کے بیٹے کا نام تھا۔ اسی کے نام سے قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے اور اہل یورپ اب بھی تمام ایران کو اسی لفظ پر شیا یعنی پارس کہتے ہیں لیکن جب سے کہ ایران کے ہر ایک صوبہ اور ولایت کا جدا جدا نام رکھا گیا اُس وقت سے پارس اس خاص ولایت کو کہنے لگے۔

ہیں جن کا نظیر نہیں۔ صفحہ سمرقند¹، غوطہ دمشق، نہر ابلہ اور شعب بوآن اتا تک ابو بکر بن سعد زنگی جس کے عہد حکومت میں شیخ نے گلستاں لکھی ہے ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہیں۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہ شعب بوآن۔ اکثر شعراے عرب نے اس قطعہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے سلامی شاعر کا قصیدہ جو عضد الدولہ دیلمی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے۔

اذا اشرف المحزون من راس قلعة علی شعب بوآن استراح من الكرب
ترجمہ: جب غمگین آدمی قلعہ پر سے شعب بوآن کی فضا کو دیکھتا ہے تو اس کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔

فارس کے میوے عراق عجم میں جاتے ہیں۔ گرم پانی کے چشمے اور سفید کانیں فارس میں موجود ہیں۔ فارس کے آثار قدیمہ دنیا کے اُن عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانہ کے لوگ جن اور پری کے کام سمجھتے تھے۔ جیسے تخت جمشید، نقش شاپور، دحمہ فریدون اور خانہ زردشت ان کا مفصل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے۔ انہی آثار قدیمہ کی نسبت عرفی شیرازی نے کہا ہے:

از نقش و نگار درود یوار شکستہ آثار پدید است صنادید عجم را

اس کے سوا اور بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ جیسے یزدی بند، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علماء و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صد ہا سال ایران کا پائے تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قم کو دار المومنین اور یزد کو دار العباد کا خطاب دیا ہے اسی طرح شیراز کو دار العلم کے لقب سے ملقب

1۔ صفحہ حزب صفحہ وخب کی زمین اور صفحہ سمرقند ایک نزہت گاہ سمندر کے قریب تھی۔ غوطہ بھی شیب کی زمین کو کہتے ہیں۔ اور غوطہ دمشق کی ایک سیر گاہ دمشق میں تھی۔ نبلہ بھرہ میں ایک بڑا نضا مقام تھا وہاں ایک ندی تھی اُس کو نہر نبلہ کہتے تھے۔ یہ تینوں مقام اور شعب بوآن دنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے۔

کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم و فضل زمانہ کے انقلاب اور سلطنت اسلامیہ کے تنزل سے اب نہایت پست حالت میں ہے لیکن اُس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم بزرگی اور برتری کے نشہ میں اب تک بدست ہیں۔ حاجی لطف علی خان آذر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسب معاش اس قدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں۔ ہمیشہ سیرگاہوں اور قبوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں۔

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانہ میں پڑی ہے محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں میں سب سے اول ہندستان پر لشکر کشی کی ہے شیراز کا بانی ہے یہ شہر پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز شاداب قطعہ زمین پر آباد کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ ”شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پُر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو“ پھر صفاریوں¹ اور دیلمیوں² کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ میں اُس کی آبادی اس درجہ کو پہنچی کہ شہر میں اہل لشکر کی منجائش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام سوق الامیر رکھا گیا اور اُس کے بیٹے مصمام الدولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پختہ فصیل کھنچوائی۔

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پُرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ازاں جملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنار آب رکناباد گلکشِ مصلیٰ را
 شیخ علی حزیں نے بارہویں صدی ہجری میں جب کہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی اُس کو دیکھا ہے وہ اپنے سوانح عمری میں اُس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ ”شیراز کی آب و ہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے جس قدر چاہو کتاب کے مطالعہ اور فکر و غور

1- صفاریوں میں تین بادشاہ ہوئے چالیس برس اُن کی سلطنت رہی۔

2- دیلمیوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے جن کی حکومت 248 برس رہی۔

مضامین میں مصروف رہو کبھی جی نہ اکتائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارت کی لطافت و خوش اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قوی پر عجیب اثر رکھتی ہے یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعرا پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں شیخ نے بوستاں کے دیباچے میں اہل شیراز کو اُن تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے وہ حالت سفر میں ملا تھا شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعراء مصنفین ابتدا سے اخیر تک اُٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے اُن کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا۔

شیخ کا نام، نسب، ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص ہے سرگور او سلی نے اُس کی ولادت 1589 ہجری مطابق 1333ء میں لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتا بک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتا بک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی 2 کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا اس لیے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ

1۔ اُس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا صرف سال و قات سب نے لکھا ہے یعنی 691 ہجری اور اُس کی عمر 102 یا 110 یا 120 برس کی بتائی ہے پس کم سے کم عمر ماننے سے اُس کی ولادت 589 ہجری میں قرار پاتی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابوالفرج ابن جوزی جو بغداد میں اُس کا جلیل القدر اُستاد تھا اُس کی وفات کے وقت جو کہ قطعاً 597 ہجری میں ہوئی ہے شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقع ہے اس لیے اُس کی عمر 102 برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔

2۔ بوستان میں تکلہ کو شاہانِ پیشین میں لکھا ہے حالانکہ سعدی اُس کے وقت میں پیدا ہوا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ بوستان تکلہ سے چوتھے بادشاہ یعنی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے پس شاہانِ پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے۔

اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متوزع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیح کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیح کو قرار دیا ہے چنانچہ وہ بوستان میں کہتا ہے:

ندانای کہ سعد مکان از چہ یافت نہ ہامون نوشت و نہ دریا شکافت

بخوردی بخورد از بزرگان قفا خدا دادش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اُس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اُس کو تربیت کیا ہوگا کیونکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اُس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقق طوسی کا شاگردِ رشید اور ہولا کو خان کا مصاحب خاص تھا شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال شیخ اور علامہ دونوں ہم عصر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علماء اور مشائخ اور فصحاء و بلخا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطہ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے بزرگوں

سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے بزرگوں اور کاٹوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تحصیل علم کا شوق اُس کو دام تکبیر ہوا۔ اگرچہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ مدرسہ عضد یہ جو کہ عضد الدولہ دہلی نے قائم کیا تھا اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اُس وقت ایسی اتھری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتا بک سعد بن زنگی نہایت عادل، رحم دل بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اُس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُس کی نصیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتا بک اور بک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آ کر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنہوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے نکل آ کر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے:

دل از صحبت شیراز بگلی بگرفت وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعد یا حب وطن گرچہ حدیث صحیح نتواں مُرد بخشی کہ من اینجا زادم

ترجمہ: میرا دل شیراز کی صحبت سے نکل آ گیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوں سختی سے مرا نہیں جاتا۔

اُس زمانہ میں مسلمانوں کے بے شمار رے سے بلاد اسلام میں جا بجا کھلے ہوئے تھے

جہاں دور دور سے طالب علم آ کر علم تحصیل کرتے تھے۔ ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے ان کے سوا شام¹، عراق اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے 459 ہجری میں بنوایا تھا ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علماء یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر ان کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔ امام ابو حامد غزالی، شیخ عراق عبد القاہر سہروردی، استاد الائمہ ابو حامد عماد الدین موصلی اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ شیخ کو اس مدرسہ میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اس کا ہم وطن شیخ ابواسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرہ آفاق تھا مدت تک اس مدرسہ کا متولی رہا تھا۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متولی شیخ ابواسحاق کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسہ سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ یوستان میں اس نے تصریح کی ہے وہاں سے اس کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا ان میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمن ابن جوزی ہے جس کا لقب جمال الدین ہے۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بے شمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے ان کا تراشہ میرے حجرے میں ہے۔ مرنے

1۔ ان میں سے مدرسہ ناصرینہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبریں میں اور مدرسہ رواجیہ رواجیہ کے پوتے زکی ابوالقاسم بیہ اللہ کا۔ اور نیز مدرسہ الشام خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دہر اللہ بیٹ ملک عادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ وزیر صفی الدین کا قاہرہ میں اور نورین نور الدین ارسلان شاہ صاحب موصل کا موصل میں بہت مشہور تھے۔ ان کے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسہ ثقلیہ، قاہریہ، عزیزینہ، عزیزینہ، زہدیہ، نصیبیہ، ہلالیہ وغیرہ وغیرہ بیت المقدس، موصل، بغداد، دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے۔

کے بعد جب مجھ کو نہلا میں تو غسل کے لیے اُس تراشہ سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بیچ رہا۔

جس زمانہ میں شیخ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا اُس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی اور سرگور اوکلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علم تصوف اور طریق معرفت و سلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی وفات 561 ہجری میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اُس کے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حُسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائل علیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے اُستاد یہ سن کر شیخ پر غصے ہو اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک و حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو بُرا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو وہ رشک و حسد سے اور تم بدگوئی و غیبت سے۔

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علامہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن علماء کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گہر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بد آواز قوال سے پالا پڑا اور بھرورت ساری رات اُس مکر وہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈا سا اتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مرئی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اُس کے حکم

کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلتے میں آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی صحبت سے عالم طالب علمی ہی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اُس طریقہ کو چھوڑ کر اس کو چہ میں قدم رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ذہنوں کو بھی بچائیں۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات بتائی ہے کہ اُس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

بعد از عراق جائے خوش ندیم ہوئے ساقی بزن تو اے زان پر دہ عراقی

جس زمانہ میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اُس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا۔ اور اُس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور اربابِ حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے۔ اور بڑے بڑے شہریار اور فرماں روا بارگاہِ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصرِ خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امر اور اعیان سلطنت قصرِ خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسا دیتے تھے تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رُک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اور پھر اسی آنکھ سے اُس دار الخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہِ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایہ اقتدار یورپ، ایشیا اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اُس کی اولاد اور ہزار ہائی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا

تاریخوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحہ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اُس کی آنکھوں کے رو برو گزرے تھے جو ہلاکو خان کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا جس نے اُس کے دل میں قوم کی دلسوزی بادشاہوں کی اصلاح رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اُس نے اپنی تمام عمر امنائے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اُس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اُس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اُس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

ابیات

| ترجمہ | اشعار |
|---|---|
| 1 آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔ | 1 آسمانِ راحق بود گر خون بہا در بر زمین برزوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین |
| 2 اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔ | 2 ای محمدؐ گر قیامت می بر آری سر ز خاک سر بر آورین قیامت در میانِ خلق بین |
| 3 محل کے تاز پروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے نپک نکلا۔ | 3 نازنینانِ حرم را خونِ حلقِ نازنین ز آستانِ بگذشت و ما را خونِ دل از آستین |
| 4 زمانہ کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔ | 4 ز بہار از دور گیتی و انقلابِ روزگار در خیال کس نہ گشتی کا چنجانِ گرد و چمن |

5 دیدہ بردار ایک دیدی شوکت بیت الحرام
قیصران روم سربر خاک و خاقان بر زمین

5 جنصوں نے اُس بیت الحرام کی شان
و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر
اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے
اور زمین پر بیٹھتے تھے وہ ذرا آنکھ اٹھا کر
دیکھیں۔

6 خون فرزنداں عم مصطفیٰ شد ریختہ
ہم بر آن خاکی کہ سلطانان نہادندے چین

6 کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اُس خاک
پر بہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے
تھے۔

7 بعد ازین آسایش از دنیا باید چشم داشت
قیر در انکستری ماند چو بر خیزد تکمین

7 آئندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں
چاہیے کیونکہ انگوشی پر سے جب تلکس جاتا
رہتا ہے تو زری کلوس رہ جاتی ہے۔

8 دجلہ خونا بست زین پس گر نہد سرد نشیب
خاک نخلستان بطھا را کند با خون عجمین

8 دجلہ کا پانی تکر لہو ہو گیا ہے اگر اب
جاری رہے گا تو نخلستان بطھا کی خاک کو
خون سے رنگین کر دے گا۔

9 نوح لائق نیست بر خاک شہیدان مذا تکہ است
کترین دولت مر ایشانرا بہشت برترین

9 شہیدوں کی خاک پر نوحہ کی کیا ضرورت
ہے کیونکہ اُن کے لیے ادنیٰ نعمت فردوس
برین ہے۔

10 لیکن از روے مسلمانی و راء مرحمت
مہربان را دل بسوزد در فراق نازنین

10 ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب
دوست کا دل دوست کی جدائی میں گلوستا
ہے۔

11 ہاش تا فردا کہ بنی روزلو و رستخیز
کز لحد باروے خون آلودہ بر خیزد دفین

11 کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا
کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا منھ لے کر اٹھیں
گے۔

12 تکیہ بردنیا نباید کرد دل بروی نہاد کا سامان
گا ہے بمہراست ای برادر گہ بکین
12 یارو دنیا پر بھروسا کرنا اور اُس سے دل
لگانا نہیں چاہیے کیونکہ آسمان کبھی دوست
ہے اور کبھی دشمن۔

13 زور بازوی شجاعت برنیا یہ با اجل چون
قضا آید نما نہ قوت رای رزین
13 شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا
اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی
قوت جاتی رہتی ہے۔

14 تیج ہندی برنیا یہ روز ہجرا از نیام
شیر مردیرا کہ باشد مرگ پنہان در کین
14 جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے
اس کی اصیل تلوار لڑائی کے دن میان
سے باہر نہیں نکلتی۔

15 تجربت بیفائدہ است آزا کہ برگردید
بخت حملہ آوردن چہ سود آزا کہ برگردید زین
15 جب نصیبہ پلٹ گیا پھر اُس کا امتحان کرنا
بے فائدہ ہے اور جب زین اُلٹ گیا پھر
حملہ کرنا فضول ہے۔

16 کرگسانند از پے مردار دنیا جنگجو
ای برادر گر خرد مندی چو سیرغان نشین
16 یارو مردار دنیا کے لیے گدھ آپس میں
لڑ رہے ہیں اگر تم عقلمند ہو تو سیرغوں کی
طرح الگ بیٹھو۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا۔ تکبر اور غرور نے اُس کے دماغ کو تھل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اُس کے بیٹے ابو بکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے روٹنے کھڑے ہوتے ہیں مگر اُس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفیس سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اُس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جھے ہوئے تھے ایک بارگی

اُن میں تزلزل آگیا اور چند روز میں اُن کا اقتدار صفحہ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اُس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آپ باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابتؓ موجود ہوتے تو اُن کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے:

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہل وفا کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا
 القصہ شیخ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر مدت دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت
 کرتا رہا جب کتاب کے مطالعہ سے اُس کا جی سیر ہو گیا تو نسخے کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔
 بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُس نے تیس برس کی عمر تک تحصیل علم کی ہے اور تیس برس سیر و
 سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزلت نشینی میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ
 تیس تیس برس کے چار مسادہ حصے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں۔ اور غالباً یہ مضمون
 منوشاستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا
 گیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا۔ نجات
 الانس میں لکھا ہے کہ شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرہ کامل رکھتا تھا۔
 اگرچہ اُس کی شہرت طبقہ علماء میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرہ شعرا میں ہوئی مگر اُس کے
 کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سلجھا ہوا عالم تھا۔ بعض موقعوں پر فقہاء اور قضاة کے
 مجموعوں میں اُس کو بحث اور مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو اُس کی رائے سب پر غالب
 رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اُس کے جان پہچان کم تھے کسی
 تقریب سے قاضی شہر کی مجلس میں اُس کا گزر ہوا۔ اُس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس
 میں تمام علماء و فقہاء کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا
 بیٹھا۔ خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا اور مشکل سے پائیں مجلس میں جگہ ملی۔ اُس وقت

کسی مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقیدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دوری سے باواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے۔ جب لوگ مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم ہوں گے تو پٹھے پڑانے کیڑے والوں سے میں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ شیخ نے یہ اپنی سرگزشت بوستان میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگزشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خاص اپنی روداد لکھی ہے۔ شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے مگر ظاہر اُیہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ زیادہ تر اُس کی ہمت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اُس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کے ہم جماعت لوگ اُس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلا دشام میں اُس نے مدتوں وعظ کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہل مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا نحن اقرب الیہ من حبل الورد کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا۔ اُس نے میرا بیان سن کر ایسا پُر جوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چیت گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب، شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اُس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ عربی قصائد فصیح اور ہامزہ اُس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے سوا بیت خانہ سومنات کے قصہ میں اُس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا۔ سرگور او سلی لکھتے ہیں کہ ایشیا تک

جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ 1843ء میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی ٹیسی نے لکھا ہے کہ ”سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندستانی زبان یعنی ریختہ میں جب کہ وہ سونات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے“ مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانہ میں ہوا ہے جب کہ ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اُس کے مشہور ہیں۔

اشعار

قسطہ چو دیدم بر رخس کفتم کہ یہ کیا دیت ہے گفتا کڈرے باورے اس ملک کی یہ ریت ہے
ہمنا تھیں کو دل دیا تم دل لیا اور ڈکھ دیا ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ ڈر ریختہ شیر و شکر آمینختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے
مرزار فیع سودانے اپنے تذکرہ میں اُن اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے
مگر حکیم قدرت اللہ خان قاسم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا
جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔

سرگور او سلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے اٹھارہ
مختلف زبانیں اُن ملکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحتی کو گیا ہے۔ اس بیان میں ظاہراً کچھ
مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایک مدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا
رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے۔ شام، عراق، فلسطین، مصر، یمن
اور ہندستان میں مدت دراز تک مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے پس ضرور ہے
کہ وہ ان ملکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو اس کے سوا اُس نے اور بہت سے ملکوں کی
سیر کی ہے جس میں سے اکثر کا ذکر گلستان اور بوستان میں کیا ہے۔

شیخ کی سیاحت کا حال

سرگور اوہلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطا کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سنا۔ اُس نے ایشیا کے کوچک، بربر، حبش، مصر، شام، فلسطین، آرمینیا، عرب جملہ ممالک ایران، اکثر ممالک توران، ہندستان، رودبار، دیلم، کاشغر اور جنجون سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستمین دال¹ تک کی سیر کی تھی۔ صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ازاں جملہ ایک دفعہ پٹھان غلمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی آیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مضمون بالکل بے سرو پا ہے۔ غلمش کوئی بادشاہ ہندستان میں نہیں ہوا شاید سلطان التمش کے دھوکے میں غلمش لکھا گیا۔ بیشک شیخ نے غلمش کا ذکر گلستان میں ایک جگہ کیا ہے جہاں یہ لکھا ہے ”سرہنگ زادہ را بردر سراے غلمش دیدم“ مگر ہندستان میں کوئی غلمش یا سراے غلمش نہیں سنی گئی۔ سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہ ہوا ہے۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جوہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندستان میں آیا ہے۔ مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لیے آنا خلاف قیاس ہے خسرو کی ولادت 651 ہجری میں ہوئی ہے جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بفرس بحال پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی تھی تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیونکر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانہ وقت اور مقبول خاص و عام ہوا ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سن کر ایران سے ہندستان آئے۔ البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان

1 - ستمین دال سے مراد شاید سدکندری ہے کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں

غیاث الدین بلبن کے بیٹے قآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جس کو خان شہید کہتے ہیں شیخ سے دو بار درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئیے۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے اس لیے ان کا کلام بھی شیخ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا۔ شیخ اس وقت بہت معمر ہو گیا تھا اس سبب سے خود نہ آ سکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے دو دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اس جوہر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیے۔

شیخ کا ہندستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف بوستان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سومنات سے نکل کر ایک بار مغربی ہندستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں سے بحر ہند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے۔

شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ترکستان اور تاتاریک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے جنوب میں سومنات تک آیا اور ایک مدت یہاں ٹھہرا اور سومنات سے مغربی ہندستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب چلا گیا۔ شمال و مغرب کی طرف عراق عجم، آذربایجان، عراق، عرب، شام فلسطین اور ایشیائے کوچک میں بارہا اُس کا گزر ہوا ہے۔ اصفہان، تہمز، بصرہ، کوفہ، واسط بیت المقدس، طرابلس الشرق، دمشق، دیار بکر اور اقصائے روم کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اُس کی آمد و رفت رہی ہے۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور وہاں ٹھہرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہندستان سے مراجعت کے وقت یمن میں جانا۔ صنعا میں ایک مدت تک قیام کرنا۔ حجاز میں پہنچنا۔ اسکندریہ۔ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں۔

شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس، بحر عمان، بحر ہند، بحر عرب، بحر قلزم اور بحر روم میں اُس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ چیمبرز انسا نکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے وہ ایک سفر کا حال بوستان میں اس طرح لکھتا ہے کہ بیابان فید میں ایک رات

نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا پیچھے سے ایک شتر سوار آیا اور اُس نے اونٹ کی ٹکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کیا ہے جو جس کی آواز سن کر بھی نہیں اٹھتا، بیابان فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے ایک صحراے لقی و دق چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے۔ جو حجاج کوفہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں اُن کے رستے کے پتھوں سچ فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کوفہ سے تقریباً تین سو پچیس میل ہے اور اسی قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے۔ اس صحرا میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی راہ سے پیادہ پانچ کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اٹھائی ہیں۔

کریم خان ثند نے اپنے عہد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ہنسن کے نام سے مشہور ہے اُس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطہ کے دروازہ پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شہمیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوتان کا ترجمہ انگریزی میں چھاپا ہے۔ اُس میں شیخ کی اُس تصویر¹ کا فوٹو گراف بھی چھاپا ہے شیخ کی شبیہ میں ایک کفکول اُس کے ہاتھ میں اور ایک تبر اُس کے کندھے پر ہے جو کہ اُس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے۔

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سرو سامان اور متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے۔ اور بعض موقعوں پر اُس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔

ساتویں صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب کہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت اور عداوت ہو رہی تھی شیخ پر ایک سخت واقعہ گزرا ہے جس کا ذکر گلستان کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہل دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اُس کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اُس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرق کی ٹریپولی میں شہر کے استحکام

1۔ بنی صاحب ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفر نامہ میں اس تصویر کا حال مفصل لکھا ہے۔

اور حفاظت کے لیے شہر میں خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی ہلکیر یا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے لائے تھے) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگایا۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے۔ جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے بچے میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اُس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اُس کی ایک بیٹی تاکتہ تھی شیخ کا نکاح سودینار مہر پر مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ مگر بیوی کی بد مزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم تاک میں آ گیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں بیشک میں وہی ہوں دس دینار دے کر مجھے خریدا اور سودینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔

نجات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام کے شہروں میں سقائی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانا ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گزری ہیں۔ وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگدل کوفہ کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اُس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے۔

عالم غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی۔ اُس زمانے میں وہاں ایک بیخود نہایت دولت مند تھا۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے شیخ کے پاس آئے اور اُس بیخود کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی شیخ نے اُن کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر

بھی جائے تو بھی کتے کا جھوٹا نہیں کھاتا۔

شیخ کے وقائع سفر میں جو کہ اُس نے گلستان اور بوستان میں بیان کیے ہیں سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے جو بوستان کے آٹھویں باب میں مذکور ہے یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اُس سے پوچھا یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں۔ اور اُس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خیر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اُن کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کہی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ میں نو وارد ہوں اور اسرار نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اُس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا ”کیوں اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا؟“ میں نے ظاہر داری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا جس کے پیچھے ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہوا کہ جب اُس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اُس مورت کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے اسی کو عام لوگ اُس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اُس پجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا وہ کھسیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو

پکڑوا کر مردانہ ڈالے اُس کو پکڑ کر ایک کنویں میں گرادیا۔ اس کے بعد فوراً میں وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندستان میں ہوتا ہوا یمن کے رستے حجاز میں پہنچا۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سینکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سینکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اُس کے سوا کوئی تنفس باقی نہ رہا اس کے سوا ایسے سنانے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی تنفس موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پجاری کا ذور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے اور کیوں تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر اُس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھینچ سکی۔ اصل یہ ہے جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعہ سے دور جا پڑتا ہے۔ پس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کا اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شیخ نے بوستان کے اسی باب میں ایک بادشاہ زادہ کی حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑے سے گر کر اس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ہر پھر نہ سکتی تھی مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہو گئی۔ کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملنے کو آیا تو اُس کی طرف کچھ التفات نہ کیا۔ طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائے گا۔ اُس سے بادشاہ کو ایک پھینک آئی اور اُس کی گردن جیسے چوٹ لگنے پر ہو گئی تھی ویسی ہی پھر ہو گئی۔ اسی حکایت کو شیخ نے ایک اور 34 بیت کی مثنوی میں جو بحر ہزج میں ہے بیان کیا ہے اور یہ اُس کی کلیات میں موجود ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں قصہ کے جزئیات مختلف ہیں۔ مختصر حکایت میں سرزمین یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بوٹی بھیجی تھی اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا۔ ایک جگہ

بادشاہ کا قصہ لکھا ہے اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ اسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشرطیکہ تاظم کو حسن بیان اور زینت الفاظ کا پورا پورا خیال ہو قصہ کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے۔ پس یہ نسبت اس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اس کے بیان کو اس مقام پر اداے مطلب میں قاصر سمجھا جائے۔

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت میں تحصیل علم کے لیے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا اور 623 ہجری میں وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانہ میں وطن نہیں آیا۔ کیونکہ اُس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر و خراب دیکھی تھی۔ اتا بک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خان ابو بکر اپنے باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اُس نے فارس کو جو دو سو برس سے مورد آفات و حوادث تھا چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کیے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اُس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور یکتا می حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اُس کی شہرت سن کر آتے اور اُن کی کمال تعظیم و احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں، عبادت خانے، مدرسے اور مسجدیں جو ویران ہو گئی تھیں اُس کے عہد میں آباد کی گئیں۔ اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حافظ طیب اُس پر مامور کیے۔ اپنا دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو ہمیشہ مغول تاتار کے سیلاب بلا سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی محفوظ رکھا۔ اور 623ء سے 658ء تک سلطنت کی مدت تک اُس کے عہد میں شیخ نے شیراز کا رخ نہیں کیا اور اطراف

و جوانب میں سیر و سیاحت کرتا رہا۔ مگر جب ابو بکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و امان قائم ہو گیا تب شام سے عراق عجم ہوتا ہوا اور اصفہان میں ٹھہرتا ہوا جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے مفہوم ہوتا ہے شیراز میں پہنچا۔ شیخ کی کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے جس سے ثابت ہے کہ اُس نے ایک مدت دراز کے بعد ابو بکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی۔ وہ قطعہ مجتہد یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ

| ترجمہ | اشعار |
|--|---|
| 1 تجھ کو معلوم نہیں؟ کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں توقف کیا۔ | 1 ندانی کہ من در اقالیم غربت چہ روزگارے بکردم درنگی |
| 2 میں ترکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ڈولیدہ ہو رہا تھا۔ | 2 بدون رتم زنگ ترکان کہ دیدم جہان در ہم افتادہ چون موے زنگی |
| 3 سب آدمی کے بچے تھے لیکن خونخواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے۔ | 3 ہمہ آدمی زاد بودند لیکن چو گرگان خونخواری تیز جنگی |
| 4 شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر شہر کے لوگ جنگی مانند شیروں کے تھے۔ | 4 درون مردی چون ملک نیک محضر بدون لشکرے چون ہزیران جنگی |
| 5 جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی۔ | 5 چو باز آدم کشور آسودہ دیدم پانگان رہا کردہ خوئے پلنگی |
| 6 اگلے زمانہ میں جب کہ ملک کو آشفته اور پریشان اور تنگ دیکھا تھا ملک کا وہ حال تھا۔ | 6 چنان بود در عہد اول کہ دیدم جہان پر آشوب و تشویش و جنگی |

7 چہن شد در ایام سلطان عادل | 7 اور اب بادشاہ عادل ابو بکر بن سعد زنگی
اتا بک ابو بکر بن سعد زنگی کے عہد میں یہ حال ہو گیا ہے۔

شیراز میں پہنچ کر ظاہر اشخ نے جامہ علم و فضیلت اُتار کر بالائے طاق رکھ دیا تھا کیونکہ
اتا بک ابو بکر میں باوجود اُن تمام خوبیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک نہایت سخت عیب بھی
تھا۔ وہ ہمیشہ علماء و فضلاء سے بدگمان رہتا تھا اور جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا تھا
اور اُن کے ساتھ کمال ارادت و عقیدت ظاہر کرتا۔ اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر
آئمہ و علماء کو اُس نے جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا۔ از انجملہ امام صدر الدین محمود واعظ اور امام
شہاب الدین تودہ پشتی اور مولانا عز الدین ابراہیم قیسی کو کہ اقسام علوم میں یگانہ روزگار تھے
بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا۔ قاضی عز الدین علوی جو کہ سندی سید اور
دار الملک کا قاضی القضاة تھا اُس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ صاحب سعید عمید الدین
اسعد کو جو کہ بے مثل ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا ماخوذ کیا اور معاً اُس کے
بیٹے تاج الدین محمد کے ایک قلعہ میں قید کر دیا یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مر گیا۔

اسی سبب سے اہل علم اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جہلا مشائخ کے
لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ تاریخ و صاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر
ابو بکر کے دربار میں آیا۔ اتا بک نے اُس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب نماز مغرب کا وقت
آیا تو اسی کو امام بنایا۔ شاہ صاحب نے قرأت غلط پڑھی مگر جس قدر انھوں نے قرأت میں
غلطیاں کیں اسی قدر اتا بک کو اُن کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر انھیں
رخصت کیا۔

پس شیخ کے لیے علماء کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیونکہ بہت سی صفات اُس
میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اُس کا مرجع خلائق بنا ایک ضروری امر تھا۔ مثلاً علم و فضل،
شاعری، لطیفہ گوئی و بذلہ سخی، فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ اور اہل علم کے مرجع خلائق بننے سے
ابو بکر ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہوں اور عالموں کے چال چلن پر خوردہ گیری
کرنی ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلمی کھولنے اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید
خیالات اپنی نظم و نثر میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا اور اس غرض کے لیے علماء اور واعظین

کے لباس میں رہنا ہرگز مناسب نہ تھا ظاہر اذہ اسی سبب سے جیسا گلستان کے دیباچہ میں مذکور ہے ابو بکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا۔ زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جس کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ہے۔ اس سے ارادت اور عقیدت تھی اور اسی کے نام پر گلستان لکھی گئی ہے۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا اس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور ان کی بد خصلتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں مگر اُس نے ایسے لطیف پیرایوں میں ان پر چونٹیں کی ہیں کہ کسی کو اُس پر گرفت کا موقع نہیں ملا۔ اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اُس نے تعریفیں کی ہیں۔ کہیں مدحیہ قصائد میں اول مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور ان کو ظلم و تعدی کے بُرے نتائج سے متنبہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیت کے حقوق بتائے ہیں اور ان کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں۔ اتنا بک جو علماء کا مخالف اور مشائخ و زہاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا اس کی تنبیہ کے واسطے گلستان اور بوستان میں اُس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اُس کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بستان سرائی اُتارا۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کے آرام و آسائش پائی شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا۔ ہیئت و صورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا اور کہا جس قدر کہ مجھ کو علماء اور زہاد سے محبت ہے ایسی اور کسی گروہ سے نہیں فیلسوف وزیر نے عرض کیا حضور! شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لیے علماء کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زہادوں کو کچھ نہ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قائم رہیں۔

ایک اور اس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل

اتا بک ابو بکر کی حالت کے مناسب ہے یعنی ”ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی اُس نے منت مانی کہ اگر اس میں کامیابی ہوگی تو اس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کروں گا جب اُس کی مراد پوری ہوگئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن ادھر ادھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا حضور! ہر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا تو کیا بکتا ہے! میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہوں گے کہا حضور! جو زاہد ہیں وہ لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ یہ بات سن کر ہنس پڑا اور فرمایا کہ جتنی مجھ کو درویشوں اور خدا پرستوں سے عقیدت ہے اسی قدر اس مرد کو ان سے عداوت ہے مگر کہتا سب سچ ہے“ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں گلستان اور بوستان میں موجود ہیں۔ گلستان کی ایک حکایت میں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ہے اُس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطین عہد اور مشائخ روزگار کے عیب اور بُرائیاں بیان کی ہیں۔ اس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرفدار اور مداح قرار دیا ہے مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولت مندوں کی مذمت کرتا ہے اور شیخ ہر دفعہ اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تو نگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے۔

بادشاہوں کے جور و ظلم اور بے باکی و سفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچا جوش پیدا ہو گیا تھا جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علماء اور صلحا سے ملاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاء الدین جوینی جو کہ سلطان ابا قاسم¹ کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے اُن سے بھی ملاقات کرے ایک روز اُن سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا ابا قاسم

1- ہلاکو خان کا بیٹا جو اُس کے بعد بادشاہ ہوا۔

کی سواری آتی ہے اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کتر کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا اور فوراً گھوڑوں سے اتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بو سے دیے بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اس راہرو کی برابر نہیں کی یہ کون شخص ہے؟ جب دونوں بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے تو ابا قاخان نے خواجہ شمس الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی صاحب دیوان نے عرض کیا حضور یہ ہمارا شیخ ہے حضور نے سنا ہوگا شیخ سعدی اسی کا نام ہے اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے۔ ابا قاخان نے کہا کہ اس سے ہم کو بھی ملو اؤ۔ چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے اور اُس کو بادشاہ کے حضور میں لائے۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت کرو۔ شیخ نے کہا دنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔ مگر نیکی یا بدی۔ اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سولے جاؤ۔ ابا قاخان نے کہا اس مضمون کو نظم کر دو تو بہتر ہو۔ شیخ نے اسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا:

شے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد حلال باد خرابش کہ مزد چوپانی است
وگر نہ راعی خلق است۔ زہر مارش باد کہ ہرچہ میخورد از جزیہ مسلمانی است

ابا قاخان یہ قطعہ سن کر آبدیدہ ہو گیا اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں۔ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ورنہ دوسری بیت۔ ابا قاخان شیخ کی اس آزادانہ ہند و موعظت سے نہایت خوش ہوا اور شیخ کو بہت عزت سے رخصت کیا۔

علی بن احمد جامع کلیات شیخ اس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے مشائخ و علماء ایسی بیباکانہ نصیحت ایک بقال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے زمانہ کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اُس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابا قاخان ہلاکو خان کا بیٹا اور چنگیز خان کا پوتا تھا جو اسلام اور

مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ اگرچہ ابا قحان کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی لیکن وہ بہر حال اسلام سے بیگانہ تھا اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اُس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ایسا کام اُسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدہ کی اُمید جیسا کہ شیخ نے گلستان میں خود لکھا ہے ”نصیحت بادشاہان گفتن کے را مسلم است کہ بیم سر ندارد و اُمید زر“۔

سردار انکیانو جو بعد زوال خاندان اتابکیہ کے 667 ہجری میں سلطان ابا قحان کے حکم سے صوبہ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا۔ ایک مغل صاحب ہیبت و شان نہایت رعب داب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا۔ اور ہمیشہ علمائے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور اُس کی ہیبت سے بڑے بڑے اہل منصب لرزتے تھے۔ غالباً اُس نے شیخ سے درخواست کی تھی جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پند نامہ جو اُس کے کلیات میں موجود ہے سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اس پند نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ، حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے اور اُس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سردار انکیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و موعظت ہی میں ختم کر دیے ہیں۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی فارس اور عراق عجم میں۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تربت پر محکف تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن سے حملہ کا اندیشہ ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ شیخ نے کہا کمزور رعیت پر رحم کرنا کہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اُس نے ایک لغو خیال پکا یا اور بیہودہ امید باندھی ہے۔

اگرچہ سلطنت عہد کے اعیان و ارکان میں شیخ کے معتقد اور ارادت مند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعہ نظم کا نام صاحبیہ رکھا ہے اور اُس کا بھائی علاء الدین جس نے سب سے اول مغول تاتاری کی فتوحات کے بیان

میں ”تاریخ جہان کشا“ لکھی ہے شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال ان دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جوین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطہ تھا۔ یہ دونوں بھائی وہاں کے سندی سادات میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعہ سے خانان تاتار کے عہد حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خان نے وزیر سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدین جوینی کو عطا کی تھی اور اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین کو ملک بغداد اور اُس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خان کے بعد ابا قاخان باپ کا جانشین ہوا تو اُس نے پہلے سے بھی شمس الدین کا زیادہ مرتبہ بڑھا دیا۔ اور سلطنت کی باگ بالکل اُس کے قبضہ میں دے دی۔ اب اُس نے مہمات سلطنت کے انصرام سپاہ و رعیت کی دلجوئی اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق، خراسان، بغداد، شام اور آرمینیا کے بادشاہ اور حاکم سب اُس کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اُس کی فیاضی اور سخاوت کی دھوم دور و نزدیک پہنچی تھی۔ باوجودیکہ اُس کا حکم کنارہ جیچون سے شام اور ایشیاے کوچک تک نافذ اور جاری تھا۔ اس پر وہ علماء و فضلاء کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا اور اُن کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اُس نے احسان نہیں جتایا ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کی تعظیم و مدارات اُن کے مرتبہ کے موافق کرتا تھا اور علاوہ کمالات علمی کے علم ادب اور شعر میں بھی اُس کو یدِ طولی حاصل تھا۔ زیادہ تر اُسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شایع ہوا اور اُسی کے فیض صحبت سے ابا قاخان کے بھائی سلطان احمد¹ نے اپنے گھرانے میں سب سے اول اسلام قبول کیا آخر ارغون خان برادر سلطان احمد کے ہاتھ سے 663 ہجری میں شہید کیا گیا۔ شہادت سے چند ساعت پہلے اُس نے تھوڑی سی مہلت چاہی تھی اُس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام ایک وصیت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلاء تبریز کو لکھا جو کہ تاریخ و صاف میں بحکے منقول ہے اور جس سے اُس کا کمال استقلال اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے۔

1 - سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے گودارتھا تاتاریوں میں اس سے پہلے صرف برکہ خان جو تی خان کا بیٹا اور

چنگیز خان کا پوتا مسلمان ہوا تھا جس کے پاس خوارزم و دشت قپچاق اور روس وغیرہ کی حکومت تھی۔

اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین جوینی نے بغداد کی حکومت کے زمانہ میں اُس
 اُجڑے اور ویران شہر کو جو کہ ہلاکو خان کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا چند روز میں
 اپنے عدل اور شفقت اور دلجوئی رعایا سے از سر نو معمور کر دیا۔ نجف اشرف میں نہر کھدوائی
 جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہو اور فرات کا پانی کوفہ کی مسجد میں لے گیا۔ تاریخ
 میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے وہ اس فیاض اور
 دانشمند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے تاریخ جہان کشا جو اُس نے تاریخوں کی فتوحات
 کے بیان میں لکھی ہے وہ اُن تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں۔

الغرض یہ دونوں بھائی جو دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالات علمی میں بھی امتیاز رکھتے
 تھے اور نیک سیرتی اور حسن اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے۔ شیخ سعدی کے ساتھ اُن کو حد
 سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا اور شیخ کو بھی جیسا کہ اُس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات
 سے ظاہر ہوتا ہے ان دونوں سے انتہا درجہ کی محبت اور الفت تھی۔ ظاہر ہے کہ شیخ نے سفر
 ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی اُس کے تمام اخراجات اور اُس کی خانقاہ کے
 مصارف کے متکفل خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاء الدین تھے۔ ایک بار خواجہ شمس الدین نے
 پانچ سو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دار السلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں
 بھیجے۔ راہ میں غلام نے شیخ کی معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھرد سے پر اُس میں سے ڈیڑھ
 سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیے۔ شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان
 کے خط میں پانچ سو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں اُس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ
 بھیجا:

خواجہ تشریف فرستادی و مال مالت افزون باد و نصرت پانچمال
 ہر بدینار بیت سالے عمر باد تا بمانی سید و پنجاہ سال
 ترجمہ: تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی۔ تمہاری دولت زیادہ اور تمہارے دشمن
 پانچمال ہوں۔ تمہاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہو گی تا کہ تم ساڑھے تین سو
 برس دنیا میں رہو۔

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبیخ کی اور رقم کی بابت تدارک مافات لڑ کے شیخ سے معافی¹ چاہی۔ اس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں ایک بار اُس نے اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا۔ جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اُس کے تقاضے کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا:

قطعہ

| | |
|------------------------------------|---------------------------------|
| سفیۃ حکمیات و نظم و نثر لطیف | کہ بارگاہِ ملوک و صدور را شاید |
| بصدر صاحب صاحبقران فرستادم | مگر بعین عنایت قبول فرماید |
| سفیۃ رفت و ندانم رسید یا نرسید | بدان دلیل کہ آئندہ دیری آید |
| پارسائے ازین حال مشورت بردم | مگر ز خاطر من بند بست بکشاید |
| چہ گفت۔ گفت ندانی کہ خواجہ دریائست | نہ ہر سفینہ زود یا درست باز آید |

ایک بار خواجہ علاء الدین نے جلال الدین ختئی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا تہمیریز سے یہ حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیج دو مگر اُس وقت جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی جب شیخ کو اس حال کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ہنسی سے خواجہ علاء الدین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا:

قطعہ

پیام صاحب دیوان علائے دولت و دین کہ دین بدولت ایام او ہی نازد

1۔ برفیق بخارائی جو ایک زبردست شاعر ہے اُس کو بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے۔ بادشاہ نے اُس کو پانچ سو تومان

انعام میں بھیجے تھے مگر اُس کو دو سو پہنچے اُس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا۔ قطعہ

شاہ دشمن گداز دوست نواز آن جہا نگیر کو جہان دار است بش یوز آلتون کرم نمود بسن لطف سلطان چند و بسیار است
 مردانہ جملہ غائب است و کون در بر آتم و صد پدیدار است یا مگر من لفظ شنودستم یا کہ پروانہ ہما طلبگار است
 یا مگر در عبارت ثریا بش یوز آلتون دوست دینار است

مگر اس قطعہ میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعہ کی سی شوخی اور لطافت نہیں ہے۔ بش یوز آلتون کو بش یز آلتون

پڑھنا چاہیے۔ یہ ثریا الفاظ ہیں جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے۔

رسید و پایہ حرمت فزود سعدی را
 مثال داد کہ صدر سخن جلال الدین
 و لیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود
 قبول حضرت اورا تعہدے سازد
 جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا
 چنانکہ بر ہمہ ابتایے دہری تازد
 مع بریدم ازد درسرائے عقبے نیز
 کہ از مظالم مردم بمن نہ پردازد

ترجمہ: صاحب دیوان علاء الدین جس کے عہد دولت پر دین کو ناز ہے اُس کی تحریر پہنچی اور سعدی کو عزت بخشی۔ قریب تھا کہ اُس کا سر آسمان تک پہنچ جائے۔ اُس میں حکم تھا کہ امیر جلال الدین اُس کے فرمان کی تعمیل کرے مگر اُس پر لشکر اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی جیسی کہ سب پر ہوا کرتی ہے۔ اب جلال الدین دنیا میں تو آنے والا ہے نہیں کہ خدا کے بندوں کی خبر لے۔ میں نے آخرت میں بھی اُس سے امید قطع کی کیونکہ وہاں لوگوں کے استغاثے اُس کو میری طرف کا ہے کو متوجہ ہونے دیں گے۔

خواجه علاء الدین نے فوزاً اُس کی سلاخی کی اور عذر چاہا۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اب اُس کی قبر ہے یہ بھی صاحب دیوان کے روپیہ سے بنی تھی۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار دینار اُس نے شیخ کو دیے تھے۔ شیخ نے ہر چند اُن کے لینے سے انکار کیا مگر صاحب دیوان نے بہ ہزار منت و سماجت اُس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اس رقم سے ایک عالی شان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشہ شمال و مغرب میں شہر سے ملا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک وہیں عزلت نشین رہا۔

شیخ سے اکثر اہل علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا۔ از انجملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشاق و ماہر تھا نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق۔ چونکہ اس قطعہ سے اُس زمانہ کے علماء کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ:

سالک راہ خدا پادشہ ملک سخن
 اے ز الفاظ تو آفاق پُر از ذریم
 اختر سعدی و عالم ز فروغ تو منیر
 واضح عقلی و کیتی ز نظیر تو عقیم

پیش اشعار تو شعر دگران را چه محل
بندہ را از تو سوالی است کہ توجیہ سوال
مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق
گر چه این ہر دو بیک شخص نیاند فرود
پایہ منصب ہر یک از کرم باز نمائی
باد آسودہ و فارغ ز بد و نیک جہان
سخ نے اُس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے جو اُس کے کلیات
میں موجود ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور
اطاعت کرتا تھا۔ سردار اٹلیانو کو وہ برابر قصائد اور پند نامہ وغیرہ میں اس طرح خطاب کرتا
ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اُس کے سوا ملک عادل شمس الدین جو کہ
غالباً اٹلیانو کے بعد شیراز کا حاکم ہوا تھا وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا۔
ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو
زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں سبزی فروشوں کے ہاتھوں جبراً کسی وعدہ
پر مہنگے نرخ سے بیچنی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دوکان پر بھی جو کہ خاص
بادشاہی ڈپوڑھی کے پاس بقالی کی دوکان کرتا تھا بھجوائے۔ شیخ اس زمانہ میں حضرت
ابو عبد اللہ¹ ابن خنیف کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی اس واقعہ کی خبر پہنچی۔ اُس نے ملک
شمس الدین کو جو کہ اس حال سے بے خبر تھا ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہل فوج کی شکایت اور
اپنے بھائی کی دوکانداری اور بے نوائی کا حال نکھاتا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اُس کا تدارک کیا
اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درم پیش کر کے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی
کے خرچ کے لیے ہے اُس کو قبول کیجیے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی۔

1۔ یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں جن کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاری نے لکھا ہے کہ

حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خنیف کی برابر نہیں ہیں۔

شیخ کی وفات شیراز میں جب کہ اتابکان فارس کے خاندان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایت فارس خانان تاتاری حکومت میں آگئی تھی 691 ہجری میں واقع ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے اُس کے مرنے کی تاریخ اس طرح کہی ہے:

دُر بحر معارف شیخ سعدی کہ در دریائے معنی بود غواص
 مہ شوال روز جمعہ روحش بدان درگاہ رفت از روی اخلاص
 یکے پر سید سالہ فوت کفتم ز خاصان بود ازان تاریخ شد خاص
 691ھ

شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور اکثر نے ایک سو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے بنوانی کے زمانہ میں شیراز سے باہر گیا اور بغداد میں اُس نے مدتوں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کیا ہے۔ امام ابن جوزی کی وفات 597ھ میں ہو چکی تھی۔ اور شیخ کی وفات اُس سے 94 برس بعد واقع ہوئی پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اگر ایک سو دس برس کی عمر قرار دی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانہ میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے اسی طرح دوسری بات خلاف واقع ہے۔

سرگور اوہلی نے انگلستان کے ایک سیاح ولیم فرنیٹکن کے سفر نامہ سے جو کہ 1786ء میں فارس گیا تھا شیخ کے مدفن کا حال اس طرح لکھا ہے کہ ”شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک

1۔ سرگور اوہلی نے اُس کی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر مظفر شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اتابک محمد شاہ 661ء تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مر گیا۔ پھر اُس کا بھائی سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور 662ء میں قتل کیا گیا پھر سعد زنگی کی بیٹی آیش خاتون کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا اور 667ھ میں اُس کو معزول کر کے سلطان ابا قاسم نے سردار انکیا نو کو جو کہ شیخ کا مددگار ہے حاکم فارس مقرر کیا۔ اب آگے کوئی تنفس اتابکان فارس کے خاندان کا حکمراں نہیں ہوا۔ پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا خاندان اتابک کے زوال سے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے۔

میل جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اُس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر سنگی بنی ہوئی ہے۔ جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے جس میں شیخ کا اور اُس کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اُس پر شیخ ہی کا ایک شعر خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جب اس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اہل اسلام جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعہ کے لیے ایک نسخہ شیخ کے کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں یہ اشعار انہوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرہ کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اب اس کی خبر جلد نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائے گی۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ زمانہ کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اُس کی مرمت کرانے کا خیال نہیں۔ اس مقبرہ کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں جنہوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے۔ اس کے بعد سرگورادلی صاحب لکھتے ہیں کہ 1811ء کے شروع میں جب کہ میں جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاجار کے پاس پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا اُس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسز فرینکلن کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے۔ اُس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں وہاں تھے اُن کا اب نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اس مقبرہ کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے اور میرے حسن عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرہ کی مرمت کرادوں۔ مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اُس وقت فارس کا گورنر تھا اُس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اپنے روپیہ سے مزار کی مرمت کرادوں گا آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں شیخ

کے مزار کی مرمت اسی خوبی اور اسلوب اور عمدگی سے کراؤں گا جیسے کریم خان زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

نہایت تاسف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطہ ایران کا فخر جو زہد و تقویٰ اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔

سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب زمین کے اُس کنارہ کا رہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے باوجود اختلاف مذہب، اختلاف قوم اور اختلاف ملک کے ایک مسلمان مصنف کی ایسی قدر کرے کہ عالم سفر میں اُس کے مقبرہ کی مرمت کرانے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے کو موجود ہو۔ اور ایک مسلمان شاہزادہ سے باوجود اتحاد زبان، اتحاد مذہب، اتحاد قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے۔

﴿فاعتبروا یا اولی الابصار﴾

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شہرت اُس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا جہ چا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران، ترکستان، تاتار اور ہندستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستان کے دیباچہ میں کہتا ہے ”ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ وصیت بخشش کہ در بسیط زمین رفتہ“ شیراز اور کاشغر میں کچھ کم 16 سو میل کا فاصلہ ہے پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے وہاں کے چھوٹے بڑے اُس کے کمالات سے واقف تھے۔

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ہے۔ غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خان چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لیے اُس کی صلح ہو گئی ہے۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمہ زنجیری ہاتھ میں لیے زبان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ”ضرب زیند عمرو اشیخ اُس سے پھل کی باتیں کرنے لگا اور کہا کیوں صاحب خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی مگر زید اور عمرو کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ فرمایا خاک پاک شیراز۔ اُس نے کہا کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؟ شیخ نے بطریق مزاح اسی وقت دو عربی شعر کہہ کر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے اگر کچھ اُس میں سے یاد ہو تو پڑھے۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے:

1۔ علامہ جارا اللہ زنجیری صاحب تفسیر کشاف نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے اُس کا نام مقدمہ

شعر

اے دلِ عشاق بدام تو صید ما بتو مشغول و تو با عمر و زید
صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے اس طالب علم سے کہہ دیا کہ
سعدی یہی شخص ہے۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے آپ
نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے سعادت حاصل کرتا۔ اگر اب بھی چند
روز شہر میں چل کر قیام کیجئے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں اس کے جواب میں
آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

اشعار

بزرگے دیدم اندر کو ہمارے قناعت کردہ از دنیا بہ غارے
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی کہ بارے بند از دل بر کشائی
گفت آنجا پر یویان نغزند چو گل بسیار شد پیلان بلغزند

اسی طرح ملتان سے جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے دو بار خان شہید سلطان محمد قان
نے شیخ کی شہرت سن کر اُس کو وطن سے بلایا مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آسکا۔
تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام¹ تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے وہ
نہایت مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے تب تک اُس سے
چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے فوزاً نہایت شرمندگی سے
عذر معذرت کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا کمال تعظیم اور ادب
سے اس کی مہمانداری کی۔

سرگور اوکلی نے کتاب مجالس العشاق سے ایک حکایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے
کہ حکیم نزاری قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج آدمی تھا اور اسماعیلی
مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص
خراسان کا رہنے والا ہے شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو کوئی خراسان میں جانتا ہے؟ کہا اُس کا کلام

1 - خولجہ ہمام الدین باوجود نسبت باطنی اور کمالات علمی کے تبریز کے امرا میں سے تھا اور شاعری میں تمام

معاصرین اُس کو مانتے تھے۔ محقق طوسی سے تحصیل علم کی تھی اور 713ھ میں وفات پائی۔

وہاں عموماً زبان زدِ خلاق ہے۔ اور پھر شیخ کی درخواست سے اُس کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر شیخ مفلوظ ہوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخردونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھل گئی۔ شیخ نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اور بہت دن تک اُس کو جانے نہ دیا اور بہت خوشی سے دل کھول کر اُس کی مہمانداری کی۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اُس کو دکھائیں گے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک بھی پہنچ گیا۔ اُس کو کمال افسوس ہوا اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمانداری میں شاید کوئی قصور دیکھا۔ حسن اتفاق سے شیخ کا گزر قہستان میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی۔ حکیم بہت محبت اور اخلاق سے پیش آیا مگر دعوت میں کچھ زیادہ تکلف نہیں کیا۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رکمی اور سیدھا سادہ تھا۔ دوسرے وقت ایک بھنے ہوئے تیر کے سوا اور کچھ نہ تھا تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلتا ہوا پارچہ اور خشکا تھا۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلفات کیے تھے اُس طرح سے مہمان آخر کو بارِ خاطر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے شیخ کو اُس جملہ کا مطلب جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا اب معلوم ہوا۔

اس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعصبات سے مبرا تھا۔ فرقہ اسمعیلیہ کے لوگ اُس زمانے میں عموماً طہ اور بے دین سمجھے جاتے تھے اور کوئی فرقہ مسلمانوں میں کے نزدیک اسمعیلیوں سے زیادہ مبغوض اور مردود نہ تھا پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی کہ اُس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر خاطر اور مدارات کی اور خراسان میں خود اُس سے جا کر ملا اور اُس کا مہمان رہا۔ الغرض یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اُس کے زمانے میں تھا اور اُس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اُس کے کلام نے حاصل کی اُس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے اُن کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا۔ انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیہر قرار دیا ہے اور وہ قطعہ یہ ہے:

قطعہ

در شعر سہ کس پیہر اند
ہر چند کہ لانا نبی بعدی
ایات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

نیز مولانا جامی نے نغمات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرت تصانیف اور جامعیت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار مقبولیت کلام کے امیر پر اس پیرایہ میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی حضر کی ملاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا آب و ہن اُس کے منہ میں ڈالے حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی۔

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہام تہریزی کو اپنی مثنوی نہ پہر میں غزل کا استاد مانا ہے لیکن دیگر اصناف سخن میں کنایا اپنے کو ترجیح دی ہے۔ مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر خود فخر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

شعر

خسرو مست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از میخانہ مستی کہ در شیراز بود
حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس کے زمانے کے اہل مذاق سعدی ہندستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

شعر

حسن گلے ز گلستان سعدی آوردہ است
کہ اہل معنی گلچین ازین گلستان اند

خواجہ مجد الدین ہمگر جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے اُس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہلا کو خان کے رکن سلطنت بھی تھے یعنی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان، امیر معین الدین پروانہ حاکم روم، ملک افتخار الدین کرمانی اور ملا نور الدین صدری نے با تفاق ہم دگر ایک قطعہ مرتب کر کے مجد ہمگر کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں امامی ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی۔ اُس کے جواب میں مجد ہمگر نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔

رباعی

ماگر چہ ۱ بہ نطق طوطی خوش نسیم بر شکر گفتہ ہائے سعدی مکسیم

در شیوۂ شاعری بہ اجماع ام ہرگز من و سعدی بہ امامی نہ ریم

اس رباعی میں اگرچہ ہمگر نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر امامی کو اپنے اور شیخ

دونوں پر ترجیح دی ہے۔

حاجی لطف علی خان آذر نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے وہ لکھتا ہے کہ بعض مدعیان شعر نے مجد الدین ہمگر سے کہ بتائیت الہی پستی طبع میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے سعدی اور امامی کی بابت محاکمہ چاہا تھا انھوں نے جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ میں نے اس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے زمانے میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا) اہل مذاق جانتے ہیں کہ ہمگر کی تحقیق کیسی محسینڈی ہے۔ ہاں انھوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ”میں امامی کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ بیشک امامی کا مرتبہ جناب صاحب رباعی سے بہت بالاتر ہے لیکن کسی طرح اُس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے بلکہ تین شخصوں² کے سوا اور کسی کی مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا زمانہ دانشمندی پر سخت گزرتا ہے ایسا زمانہ پہلے سخنوروں پر بھی گزرا ہے یا نہیں۔ جب یہ حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آ گیا۔“

1- شیخ نے بھی اس رباعی کو سن کر ایک رباعی لکھی ہے جو اس کے کلیات میں موجود ہے یعنی ”ہر کس کہ ہمارا گاہ سامی

زسد از بخت سیاہ و بدکامی زسد ہنہ ہمگر کہ ہمر خود نہ کردہ است نماز شک نیست کہ ہرگز بہ امامی زسد۔“

2- شاید تین شخصوں سے مراد فردوسی، مانوری اور نظامی ہیں۔

حاجی موصوف نے اس مقام پر مجدد ہنگر کی شان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے:

قطعہ

یکے گفت - امامی امام ہری را ز سعدی فزون یافتہ مجدد ہنگر
درین ماجرا چیست راے تو - گفتم سنگر بود مجدد ہنگر سنگر

ہمارے نزدیک اگر مجدد ہنگر اُس عصر میں جس میں سعدی اور امامی گزرے ہیں نہ ہوتا بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور امامی کے رتبے میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا معاشرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں مگر جس قدر اُن کا زمانہ گزرتا گیا اسی قدر وہ پردے مرتفع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانہ میں دو اہل کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور کچھ اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور اُن مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں اور اس طرح بڑھتے بڑھتے دو بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ شیخ اور امامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطراف عالم میں پھیل جائے گا اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائے گا۔

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے۔ ایک رات اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے جو جناب الہی میں مقبول ہوئی یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے:

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر درتے دفترت مست معرفت کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عزلت خانے پر یہ مژدہ سنانے کے لیے گئے۔ وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں شاید اس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو۔ لیکن ہم کو اس میں

کوئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔ خواب کا سچا ہونا اور ان میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اُس کا انکار نہیں کر سکتے اس کے علاوہ ہم اس حکایت سے ہر حال میں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اُس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔

اس حکایت کو اور زیادہ چکانے کے لیے شیخ ابوالفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے۔ یعنی یہ کہ فیضی نے نلدمن کی توحید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا:

شعر

در ہر بن مو کہ می نمی گوش فوراہ فیض اوست در جوش
تو اُس نے بھی ویسے ہی صلہ کی توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا آسمان کی طرف منہ کیا
اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے پتھال کی جو فیضی کے منہ پر آ کر پڑی وہ بہت جھنجھلایا اور کہا:
”شعر نبی عالم بالا معلوم شد“ ظاہر یہ مضمون عبدالقادر بداونی کا جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا
سخت دشمن ہے یا اُس کے کسی قبیح کا گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ”سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روما کے
مشہور شاعر ہورلیس کے کلام سے بہت ملتی ہے چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی اس لیے ظن
غالب ہے کہ وہ ہورلیس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا“ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک
صحیح ہے اور واقع میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں۔ ظاہر یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دہلی کی
جامع مسجد اور آگرہ کے روضہ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے
کارگروں نے بنائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت پستی کی حالت میں ہوتی ہے اگرچہ وہ
کسی زمانہ میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو جس طرح اُس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی
نظر میں حقیر اور ذلیل اور قبیح و پوچ معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور
برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے۔ اور اگر اُن کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی
طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اُس کو مجبوراً کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔

سرو لیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے اُس نے جو شیخ اور اُس کے

کلام کی نسبت لکھا ہے وہ سرگور اوہلی نے نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ سعدی نے تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ اتابکان فارس وہاں کے اہل کمال کو تقویت دے رہے تھے اپنے جوہر دکھا نے شروع کیے تھے۔ حالانکہ اُس کی تقریباً تمام زندگی سفر میں گزری تھی باوجود اس کے کہ کسی ایسے شخص نے بھی جس کو عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا۔

انگلستان کے بعض اور مصنفوں نے اس کو مشرقی ہلکسیر کہا ہے۔ اگرچہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں جو ہلکسیر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ انگریز ہلکسیر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرق کا ہلکسیر کہتے ہیں انہوں نے اُس کو کس درجہ کا شاعر تسلیم کیا ہے۔

ہلکسیر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ صاف اور دل نشیں ہوتا ہے۔ اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت اور پند پر رکھی ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتا ہے اور ہلکسیر کے پلے (یعنی ٹانگ) سن کر کسی شخص کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ میرے ہم جنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے مگر اُس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے بلکہ یہ کہتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ نیز دونوں کا کلام مقبول اور دل نشیں ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح ہلکسیر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اسی طرح شیخ کی گلستان اور بوستان کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اردو میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حُسن اور یہ بات کہ انہوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ثابت ہوتی ہے اگرچہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ ایشیا

میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم و تعلم کا چرچا ہے ایسا کسی اور کتاب کا نہیں اور اسی طرح یورپ میں جس قدر شکسیر کا کلام دائر و سائر ہے ایسا کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔ پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہ مقبول اور دل نشیں ہونے کے قابل نہ ہو کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح تمام ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے۔

کلیاتِ شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم، نثر، فارسی اور عربی جو اُس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی بن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے حسب تفصیل ذیل ہے۔

(1) نثر میں چند مختصر رسالے (جس میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور طوک و حکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) (2) گلستان (3) بوستان (4) پند نامہ (جس کو عرف عام میں کریمہ کہتے ہیں) (5) قصائد فارسی (جن میں مرہی، ملمعات، مثلثات اور ترجیعات بھی شامل ہیں) (6) قصائد عربیہ (7) غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیبات (8) دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع (9) تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم (10) غزلیات قدیم جو غالباً عنفوانِ شباب کی لکھی ہوئی ہیں (11) مجموعہ موسوم بہ صاحبیہ جس میں شیخ نے قطعات، مثنویات، رباعیات اور مفردات کو خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے (12) مطائبات و ہزلیات۔

ان تمام کتابوں اور سالوں میں سے مثنوی پند نامہ یعنی کریمہ کو بعض اہل مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اول تو کلیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مثنوی نہیں دیکھی گئی دوسرے شیخ کے عام کلام میں جو چٹنگی اور جزالت یا لفرہی اور جادو پایا جاتا ہے اُس سے یہ مثنوی معزا ہے مگر ہمارے نزدیک اس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردد کی بات نہیں ہے یہ سچ ہے کہ وہ بوستان اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کا حال بالکل اس شعر کا مصداق ہے:

شعر

گے بر طارمِ اعلیٰ نشینم گے بر پشتِ پائے خود نہ بنم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہڈیاں اور یہی وہ خاصیت ہے جو خدا کے کلام کو بشر کے کلام سے جدا کرتی ہے کَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جاتا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اُس نے اس کو بھی کلیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کے کلیات میں اسی طرح نسخوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

بہر حال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں سمجھتے اسی طرح اس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے۔

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کرے گی ہم اُن کی حقیقت ظاہر کرنے میں کوشش کریں گے ناظرین باتمکین سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اُس کو متعصبا نہ افراط و تفریط پر محمول نہ فرمائیں بلکہ اس کو ایک مقتضائے بشریت سمجھ کر اسی قدر مواخذہ کے قابل ٹھہرائیں جس قدر کہ ایک غلط (مگر سچی رائے پر مواخذہ ہو سکتا ہے۔)

گلستان اور بوستان

اگرچہ ہر تصنیف و تالیف کی ماہیت اور اُن کے عیب و خوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اُس پر ریویو لکھنا اور اُس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے۔ جس طرح بدیہیات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی طرح ایسے مقبول اور مسلم کتابوں کے محاسن بیان کرنے

مشکل ہیں اور اسی طرح ان پر نکتہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمہ لیتے ہیں اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بین لوگوں پر چھوڑتے ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہر افارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے لاکھوں استادوں نے انھیں پڑھایا۔ اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں پڑھا ان کے پیشار نئے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے۔ اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علماء نے ان کی عزت کی۔ بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا۔ فنشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت اور بلاغت کے آگے سرٹھکایا اور ان کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب اخلاق، ہند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دیگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے *احدهما الفضل من الآخر لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستان کو بوستان پر ترجیح دی جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔*

فارسی نظم میں بوستان کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستان سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اس سے بھی بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہر کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستان کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سرگور اوکلی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جنیس نے لاطینی میں کیا تھا اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

تذکرہ مجمع الفصحا جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہوا ہے اس میں یا کسی اور تذکرے میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور کوئی

کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ، مثنوی معنوی، گلستان اور دیوان حافظ۔

ہندستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں۔ جیسی ایران میں مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دل فریب چیز نہ ہو کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلف اور تصنع سے بالکل پاک ہیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہماری رائے میں گلستان کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسبت رکھتی تھیں۔ سب سے اول شاہنامہ پر غور کرو۔ قطع نظر اس سے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاہوں کے محاربات انسان کو ہمیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں کہ شاہنامہ لکھا گیا اُس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکر کشی و کشور کشائی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اور شجاعت و بہادری کے مضمون اُن کو دل سے پسند آتے تھے۔ پس ایک رزمیہ نظم کا جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جانا اُن کی حالت کے نہایت مناسب تھا۔ یہی سبب تھا کہ شاہنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صد ہادستاں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھیں۔ اور آخر کو اُس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں شاہنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے۔ اور قبوہ خانوں میں جا بجا گرمی صحبت کے لیے شاہنامہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب قصے جیسے سیرغ کا زال کو پرورش کرنا۔ طہمورث دیوبند کا دیوؤں کا قید کرنا۔ جام جمشید کے کرشمے۔ رستم کا اپنے زور سے تنگ آکر اُس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا۔ اُس کا سیکڑوں دیوؤں کو مارتا اور مغلوب کرنا۔ اُس کے رخس کا شیروں کو ہلاک کرنا۔ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصہ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے اُس میں درج تھے جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں۔ ان باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا۔

مولانا روم کی مثنوی اُس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوف اور معرفت کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ شیخ محی الدین ابن العربی، شیخ صدر الدین قونوی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ علاء الدولہ سنمانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوف کی روح پھونک رہی تھیں شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ جی لہانے لگے تھے۔ شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متبہتی اور ابوتمام کی تشبیہیں بے مزا معلوم ہونے لگی تھیں۔ حدیقہ اور منطق الطیر نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا۔ ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوف اور حقائق و معارف سے بھری ہوئی ہے مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا جیسے غزنویہ اور سلاہتھ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویہ کے عہد میں حملہ حیدری کا اس کے سوا مثنوی میں بھی صد باعجب و غریب قصے اور فوق العادہ نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور ان میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوف کے علاوہ قصہ کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں ”نیست پیغمبر و لے دارد کتاب“ اور مثنوی کے حق میں ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ کہا گیا ہے۔

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین کے سوا جو کہ ہمیشہ سے دنیا میں مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزدور اپنی طرف کھینچتے ہیں اور کوئی مضمون ہی نہ تھا۔ اور اس خیال نے کہ اُس میں عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں اُس کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور دلربا کر دیا تھا۔ پس ان تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔

گلستان میں ان وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ تھی نہ اُس میں رزم تھی نہ عجیب و غریب افسانے تھے۔ نہ فوق العادہ قصے، نہ حقائق و معارف، نہ شریعت کے اسرار، نہ طریقت کے نکات، نہ غزل عاشقانہ، نہ قول عارفانہ بلکہ اُس کی بنیاد محض اخلاق پند و موعظت پر رکھی گئی تھی جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاص کر فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ پند و موعظت جب تک قصہ یا ناک کے پیرایہ میں نہ ادا کی جائے اکثر مخاطب کی وحشت اور سخر کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متنفر اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ پس گلستان کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ

اُس کی فصاحت و بلاغت اور حُسن بیان اور لطف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لاجواب تسلیم کیا جائے اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا۔

گلستان کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانہ میں گلستان کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے کہ اُس زمانہ کے فضلا اور اُدبا اُس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زور طبع اور قدرت نظم دکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیب نامہ ارفضال اللہ بن عبد اللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانہ میں تھا اپنی مشہور تاریخ و صاف میں گلستان کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قطعہ سعدی

| | |
|-----------------------------|----------------------------|
| رَسید از دستِ محبوبے بدستم | گلے خوشبوئے در حمامِ روزے |
| کہ از بوئے دلاویز تو مستم | بدو گفتم کہ مشکِ یا عیری |
| و لیکن مدتے با گلِ نشستم | بکھتا من گلے ناچیز بودم |
| وگر نہ من همان خاکم کہ ہستم | جمالِ ہمنشین در من اثر کرد |

ترجمہ عربیہ

| | |
|--|--|
| توصل من ابدی کریم الی یدی | إذا هو فی الحمام طین مُطیب |
| فَإِنِّی مِنْ رِیَاکَ سکران معتمد | فَقُلْتُ لَهُ هَلْ أَنْتَ مَشْکٌ وَعَبِیرٌ |
| فَجَالَسْتُ لِلوَرْدِ الْجَنِّیِّ بِمَعْهَدِ | أَجَابَ بِنَانِی کَنْتُ طِیناً مُذَلَّلاً |
| وَالْآنَا التَّرَابُ الَّذِی کَنْتُ فِی بَدِ | فَأَنْتَ فِی خَلْقِی کَمَا مَجَالَسِی |

قطعہ سعدی

| | |
|----------------------------------|---------------------------------|
| تا دل خویش نیاز دارد و درہم نشود | گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند |
| قیمتِ سنگِ نیفزاید و زر کم نشود | سنگِ بدگوہر اگر کاسے زرین بشکست |

ترجمہ عربیہ

إن نال بد من اللدال منقصة حاشى له أن يلبب النفس بالصخر
فالتبر من حجر إذ صار منكسراً فالتبر تبر و ما يزداد لمي الحجر

پھر ایک مدت کے بعد تمام گلستان کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہوا جو کئی صدیوں تک عرب، شام، روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے۔ اُس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اُس کے متعدد ترجمے سُنے گئے ہیں۔ جن میں سب سے اخیر ترجمہ سلطان عبدالحمید خان کے بھائی اور ولی عہد رشاد پاشا نے حال ہی میں کیا ہے۔ یورپ میں گلستان اور بوستان کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں اُن کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے۔ مگر انگلش انسائیکلو پیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور ایڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو 1852ء تک چھپے اور شائع ہوئے اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

گلستان کے ترجمے بوستان کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے جنس نے اصل گلستان مع لاطینی ترجمہ اور کسی قدر حواشی کے امسٹرڈم میں چھپوائی۔ پھر ڈورائر نے جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کانسل تھا فرینچ میں اس کا ترجمہ کیا جو کہ 1634ء میں بمقام پیرس چھپا۔ اُس کے بعد اصل کتاب سے گارڈین نے 1789ء میں اور سیمالیٹ نے 1834ء میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرینچ میں ہوئے تھے۔ جرمن زبان میں اولی ایریس کا ترجمہ زیادہ مشہور ہے وہ اُس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس ترجمہ میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمہ سے پہلے ڈورائر کے فرینچ ترجمہ سے ایک اور ترجمہ جرمن میں ہو چکا تھا۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بہت ہی عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اول 1654ء میں بمقام سلینز وگ چھپا تھا اور اسی سال جرمن سے ڈیج زبان میں ترجمہ ہو کر امسٹرڈم میں چھپا۔ اولی ایریس نے بوستان کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستان کا ایک اور ترجمہ کے۔ ایچ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو 1846ء میں بمقام لیسبرگ چھپا ہے۔ اسی مترجم نے بوستان کا بھی ترجمہ کیا ہے جس کا نام لسٹ گارٹن ہے اور جو 1850ء میں دو جلدوں میں چھپا

ہے انگریزی میں گلستان کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو بمقام لندن 1808ء میں چھپا دوسرا ترجمہ اس صاحب کا ہے جو ایشیا تک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا۔ ایک اور ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں جو 1852ء میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ سعدی کی کلیات فارسی و عربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ہیرنگٹن نے 1791ء میں چھپوائی تھی۔ اور گلیڈون نے صرف گلستان 1806ء میں چھپوائی جو دوبارہ 1809ء میں بمقام لندن مطبوع ہوئی۔ پھر 1807ء میں ڈیولن نے گلستان معہ اپنے ترجمہ کے کلکتہ میں چھپوائی جو کہ اُس وقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چکی ہے۔ پروفیسر فاکنر نے فارسی خواں طلبہ کے لیے بوستان کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے جس میں تقریباً تہائی کتاب داخل ہے اور بعض حکایات کے ترجمے حواشی سمیت ایشیا تک جرنل میں معہ متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اے اسپرنگ نے 1851ء میں بمقام کلکتہ گلستان معہ اعراب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی اور ایسٹوک نے بمقام ہرٹ فورڈ 1850ء میں اُس کو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے معہ فرہنگ کے شائع کیا۔

مذکورہ بالا ترجموں اور اڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش انسائیکلو پیڈیا میں کیا گیا ہے اور بہت سے نئے ترجمے اور اڈیشن خصوصاً 1852ء کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ از انجملہ 1871ء میں جان پیٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسط نے اصل گلستان معہ انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی۔ اور پکتان ولبر فورس کلارک نے بوستان کا انگریزی ترجمہ 1879ء میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اُس نسخہ سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں 1851ء میں چھپا تھا۔ پھر حال ہی میں بوستان کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکین نے نظم میں کیا ہے جس کا نام فلورڈ فرم دی بوستان رکھا ہے۔

ہندستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستان کا ترجمہ ہوا ہے۔ از انجملہ میر شیر علی افسوس تخلص نے مارکوکس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اُس کا اردو ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں لکھا ہے مگر چونکہ اُس وقت تک اردو زبان خوب منجھ کر صاف نہ ہوئی تھی اس لیے زمانہ حال کے ترجمے جو اُس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور با محاورہ اور فصیح ہیں۔ بنگالی اور گجراتی میں بھی گلستان کے ترجمے ہوئے ہیں مگر اُن کا مفصل حال معلوم نہیں ہے۔ بھاشا میں اول شمال

مغربی اضلاع میں گلستان کے آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا جس کی اشاعت کو تقریباً تیس برس نزرے ہوں گے۔ اس ترجمہ کا نام مترجم نے پشوپ بانکا (یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ہے۔ اس کے بعد ہمارے دوست پنڈت مہر چند اس مہاجن اُردو ال جینی مذہب متوطن قصبہ سوئی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستان کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ہے جو 1888ء میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کا نام پشوپ بن رکھا ہے جو کہ لفظ گلستان کا مرادف ہے۔ پنڈت صاحب نے پند نامہ شیخ یعنی کریم بھی بھاشا ترجمہ چوپائی وزن کی نظم میں لکھا ہے جس کا نام شیکشاہ متری ہے۔

ترجمہ کے علاوہ گلستان بلکہ بوستان کی بھی بہت سی شرحیں اور فربہنگیں لکھی گئی ہیں جن میں سے خان آرزو کی خیابان گلستان اور نیک چند کی بہار بوستان زیادہ مشہور ہیں۔ علی الخصوص گلستان کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے۔ جس طرح اہل علم نے مختلف زبانوں میں اُس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں یا اہل تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اس پر رکھی ہے یا مثنویوں نے اُس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے اسی طرح امرانے اُس کے نسخے نہایت خوش خط لکھوا کر ان کو مطلق اور مذہب کرایا ہے یہاں تک کہ ہمارے ملک کے رئیسوں نے بھی جو درس و کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے۔ بعضوں نے ایک ایک نسخہ کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپیہ کے قریب صرف کیا ہے۔ اگرچہ ان باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن گلستان کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندستان کے رئیس اس کو اس قدر عزیز رکھیں۔ گویا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اُس وقت کرتا ہے کہ ایک اناڑیوں کی مجلس میں جا بھنسنے اور اُن کو مخلوط کر کے اُٹھے۔

گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب، اُس کے فقروں کی برجستگی، اُس کے الفاظ کی شگلی، اُس کے استعارات کی جزالت، اُس کی تمثیلات و تشبیہات کی طرقتی اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتد بہ حصہ اُس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اُس کی تنقیح و تہذیب میں اپنے فکر

اور سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔ چنانچہ دیباچہ گلستان نے اخیر میں اُس نے صاف کہا ہے کہ ”برنے از عمر گرانمایہ بروخرج کردیم“ مگر دیباچہ ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصل بہار کے آغاز میں اُس کا لکھنا شروع ہوا تھا وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہو گئی اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستان چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی مگر یہ بالکل غلط ہے جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو۔ اور جس قدر اُس میں زیادہ صفائی اور گھلاؤٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اُس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔ یورپ میں اکثر نامی مصنفوں کے مسودے بم پھینچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصہ میں جو دیزا ایک بستی ہے وہاں مشہور مصنف ایریسٹو کے مسودے اب تک موجود ہیں۔ اُس مصنف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلفی میں مشہور ہے مگر اُس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقیرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کانٹے گئے ہیں۔ لارڈ مکالی جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنف ہے اُس کا ایک مسودہ لندن موزیم میں رکھا ہے اس میں بھی جا بجا کاٹ پھانس اور حَل و اصلاح پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کانٹے گئے ہیں۔ ظاہر اشیخ نے جو گلستان کے دیباچہ میں فصل بہار کا ذکر کیا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ گلستان کے لیے جو سرمایہ اُس نے سا لہا سال میں جمع کیا تھا وہ پہلے اُس کے پاس نامرتب موجود تھا جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اُس کو مرتب کر دیا یہ ترتیب فصل بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اُس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی گلستان اور نیز بوستان کی ترتیب جس سلیقہ سے شیخ نے کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کو اس کام میں بہت دقت اٹھانی پڑی ہوگی۔ اُس نے ان کتابوں میں زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو خود اُس پر گزرے ہیں یا اُس کے سامنے پیش آئے۔ اور ہر ایک باب کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں۔ اس تمام مجموعے کو گلستان میں آٹھ باب پر اور بوستان میں دس باب پر تقسیم کیا ہے اور ہر ایک باب میں اُس کے مناسب حکایتیں درج کی ہیں اور ظاہراً علم اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو

بقدر ضرورت ان میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو۔ یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اُس میں علم اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدر ضرورت آجائے اس ترتیب کی قدر اُس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نامرتب کر کے گڈمڈ کر دیا جائے اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجہ شیخ نے استخراج کیے ہیں وہ اُن میں درج نہ کیے جائیں اور پھر تمام مجموعہ حکایت کو جدا جدا بابوں پر تقسیم کرایا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے۔

جس طرح ہر ایک ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی رہی ہے اسی طرح ایران میں بھی اول شاعری کا ظہور ہوا تھا۔ اور دوسری صدی کے اخیر سے جب کہ اول ہی اول خواجہ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا۔ کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی ہوتی رہی۔ فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدت کے بعد شروع ہو گیا لیکن شیخ کے زمانہ تک اُس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی اکثر سیدھی سادی عبارت عام روزمرہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہل علم کسی قدر خواص کے روزمرہ میں تحریر کرتے تھے چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ جو کہ پانچویں صدی میں لکھا گیا اس میں نہایت بے تکلفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ اور بعض ادیب و فاضل جن پر عربیت غالب تھی اُن کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر عربی لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراش کر تے تھے۔ مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اُس کے نعروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور تول کا لحاظ رکھنا جاری نہ ہوا تھا۔ خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانہ تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامری کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ 551ھ میں قاضی حمید الدین ابو بکر نے مقامات بدیہی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقامات حمیدی لکھی ہے اُس میں نہایت تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر صنائع لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیہی اور حریری کی طرح معنی اور مسجع لکھی ہے اور جس طرح ان دونوں کتابوں میں فرضی قصے وضع کیے گئے ہیں اسی طرح اُس میں بھی محض خیالی افسانے لکھے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر

قسم کے تصرف کرنے کا اختیار مصنف کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا اور تجنیس و ترصیح اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قدرت رکھتا تھا۔

ایک اور کتاب موسوم بہ قابوس نامہ پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر سے گزری ہے جس کا مصنف قابوس¹ بن سکندر ملقب بہ عنصر المعانی ہے یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے اور مضامین عمدہ ہیں لیکن اس کے سوا کوئی ندرت یا دفریبی اُس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی۔

غرض کہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستان کی بنیاد اُس پر رکھی گئی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اس روش کا موجد تھا اور اُسی پر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

اُس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف ایرانی نثروروں کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی یا اپنا تفلسف اور تبحر علمی جتانایا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لٹھانا اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا۔ اُس نے دونوں کتابوں میں باستثنا چند حکایتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو۔ وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کان سے سنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ عام حکایتیں جو ان دونوں کتابوں میں درج ہیں وہ اس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بد معاش سائل نے اپنے کو قرضدار ظاہر کر کے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے۔ لوگوں نے کہا یہ تو مکار تھا۔ اس کو کچھ دینا نہ چاہیے تھا۔ فرمایا اگر مکار تھا تو میں اُس کے شر سے بچا ورنہ وہ اوروں کے شر سے بچا۔

یہ کہ ایک بادشاہ زراہ کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر پڑا بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔

1۔ یہ شخص دیار آل زبیر میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے بَر جان اور بیلان وغیرہ میں اکیس برس حکمرانی کی ہے

یابہ کہ میں چند رویشوں کے ساتھ روم میں پہنچا اور ہم سب ایک ذی مقدور شیخ کے ہاں اترے اُس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔

ان سیدھی سادی حکایتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے اور اُن سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا ایک دلچسپ قصہ معلوم ہوتا ہے۔

گلستان اور بوستان کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ ان کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا اُس میں کوئی نہ کوئی لطیف اور چمکتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور یا یہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسن بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا افتادہ مضمون کو بھی اُسی قدر دلآویز طور پر بیان کر سکتا تھا جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو۔

تعب ہے کہ شیخ کی گلستان آئندہ نسلوں کے لیے نثر فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی۔ ایران میں اُس کے تتبع کا کسی نے خیال نہیں کیا یا یوں کہیے کہ کسی سے اُس کا تتبع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم و فضل شیخ سے بہر اہب فائق تر تھا مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی۔

ایران میں سب سے بڑا نثر فضل اللہ بن عبد اللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانہ میں ہوا ہے اُس کی مشہور کتاب تاریخ و صاف سے پیشک اُس کا کمال علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجہ کی استعداد کا آدمی ڈکٹرنری کھولے بغیر سمجھ سکے یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر جھیمے 712ھ میں جب کہ سلطان محمد اول لجانو خان خدا بندہ کے حکم سے آذربایجان میں شہر سلطانیہ بن کر تیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی۔ اس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی۔ سلطان نے اُس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا۔ اس وقت دربار میں وزیر رشید الدین اور قاضی القضاة نظام الدین عبد الملک اور خواجہ اصیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور

فاضل موجود تھے فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے کہ اُن سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی خاص سلطان کے سنانے کو لکھے تھے وہ پڑھنے شروع کیے سلطان ہر فقرہ کے معنی رشید الدین وغیر ہم سے پوچھتا تھا یہ لوگ اُس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا شرے شرمائے کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا۔ یہ حال تاریخ و صاف کی عبارت کا ہے اُس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اسی بات میں کوشش کی ہے کہ اُن کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور اُن کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات زود فہم الفاظ اور دلاویز عبارت میں ادا کیے جائیں۔

تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جو شیخ کے بعد گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبدالرحمن جامی کی بہارستان، دوسری مجدد الدین خوانی¹ کی خارستان، تیسری حبیب قآنی² شیرازی کی پریشان سواول ہم بہارستان کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو خارستان کا طریقہ تحریر اکثر جگہ اہل زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب دونوں کو گلستان کے مقابلہ میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کا فور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک کو دوسرے سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ حکایتیں اور روایتیں جو ان دونوں کتابوں میں درج کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت گلستان کی حکایتوں سے بہت ملتی جلتی ہیں اور زیادہ تر مجدد الدین خوانی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اُسی طریقہ پر مرتب کیے ہیں مگر شیخ کے حسن بیان اور لطف ادا سے گلستان نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند اس قسم کی ہم شکل

1۔ یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا۔ خوف خراسان میں ایک مشہور ہستی ہے۔ کہتے ہیں کہ خارستان اس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی۔

2۔ یہ شخص زمانہ حال کا ایک نہایت مسنم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہل ایران خاتم اشعار سمجھتے ہیں۔ اُس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گزرے۔

اور ہم جنس کتابوں میں پورا پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے ممکن نہیں ہے۔ لیکن چند متحد المضمون فقروں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلآویز ہے اور کون سا کم اس لیے چند ایسی مثالیں جو نہایت دقت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں۔ اس مقام پر نقل کی جاتی ہیں۔

گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

بہارستان: اسکندر را گفتند بچہ سبب یافتی آنچه یافتی از دولت سلطنت و مملکت با صغرن و حداشت عہد۔ گفت با ستمالت دشمنان تا از غاکمہ دشمنی زمام ناکند و از تعاہد دوستان تا در قاعدہ دوستی استحکام یابند۔

بیت

بایدت ملک سکندر چون وے از حسن سیر
دشمنان را دوست گردان دوستان را دوست تر

گلستان: اسکندر را پرسیدند کہ دیار مغرب مشرق را بچہ گرفتگی کہ ملوک پیشین را خزائن و عمر و ملک و لشکر پیش از تو بود و چنین فتحے میسر نشد۔ گفت بعون خداے عزوجل ہر مملکتے را کہ گرفتم رعیتش را نیاز روم و رسوم خیرات گذشتگان باطل نہ کردم و نام بادشاہان جز بہ نگوئی نہ بردم۔

بیت

بزرگش نخواستند اہل خرد کہ نام بزرگان بڑشتی برد

قطعہ

این ہمہ ہیچ است چون می بگذرد
بخت و تخت و امر و نہی گیر و دار
نام نیک رفتگان ضایع کن
تا بماند نام نیکت یادگار

ان دونوں عبارتوں میں باعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اُس کا فیصلہ زیادہ تر ذوق صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قید بیان میں آسکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سے محض گلستان کی فوقیت جتنی مقصود ہے نہ کہ بہارستان کی تنقیص کرنی۔ اول "اسکندر را پرسیدند" اور "اسکندر را گفتند" میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ سوال کے موقعہ پر پرسیدن بہ نسبت گفتن

کے زیادہ مناسب ہے۔ دوسرے شیخ کے ہاں خزانہ و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے۔ اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت دونوں ورنہ صرف لفظ مملکت حشو ہے اور صفرن کے بعد حدیث عہد بھی حشو ہے۔ تیسرے شیخ کے ہاں بیان میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ باوجود کمی لشکر و ملک و عمر و مال کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا۔ اور مولانا کے ہاں سوال کی وجہ ایسی ظاہر نہیں ہے کیونکہ تھوڑی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے۔ چوتھے سکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اُس میں ہرگز اس سے زیادہ اختصار کی گنجائش نہ تھی ورنہ سکندر کا جواب نا تمام رہتا۔ اور جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے وہ ان لفظوں میں ادا ہو سکتا تھا۔ ”بہ استمال دشمنان و تعابد دوستان“ اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ پانچویں شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے وہ کئی وجہ سے مولانا کے نتیجہ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ شیخ کا نتیجہ لازمی ہے۔ اور مولانا کا نتیجہ غیر لازمی۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنائے گا اُس کو ضرور سکندر کی سی سلطنت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جاوے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کر سکتا۔ نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے۔ کیونکہ سلف کی تعظیم اور ادب اور اُن کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں مشرکات ہے اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطین الوالعزم کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ ملک سکندر کی خواہش اُن کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی۔

گلستان:

راز یکہ نہاں خواہی با کسے در میان منہ اگر چہ
دوست باشد کہ مرآن دوست را نیز دوستان
باشند و چہ نہیں۔

بہارستان:

اسرار نہان خود را با بیچ دوستی در میان منہ زیرا
کہ بسیار بود کہ در دوستی خلل افتد و بد دشمنی بدل
گردد۔

مسلل قطعہ

خامشی بہ کہ ضمیرِ دلِ خویش
با کے گفتن و گفتن کہ گوئے
اے سلیم آب ز سر چشمہ بہ بند
کہ چوں پُرشد نتوان بستن جوئے

بیت

سخنے در خلا نباید گفت
کان سخن بر ملا شاید گفت

قطعہ

اے پسر سرے کش از دشمن نہفتن لازمست
بہ کہ از افشائے آن بادوستی کم دم زنی
دیدہ ام بسیار کز سیر سپہر کج نہاد
دوستاں دشمن شوند و دوستیہا دشمنی

قطعہ

بر سر سر بمہر کہ افتد بخاطرت
سرعت مکن بہ موج بیانش نگاشتن
ترسم شود غرامتِ اظہارِ آن ترا
مشکل تراز ندامتِ پوشیدہ داشتن

اس مثال میں بھی گلستان کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ بلیغ ہے۔
(1) شیخ کہتا ہے "راز یکہ نہان خواہی" یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو اُسے کسی سے نہ کہو۔ اور
مولانا کہتے ہیں "اسرار نہان خود را"۔ یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو۔ حالانکہ بعضے
بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ایک مدت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں مگر جن کا چھپانا منظور
ہوتا ہے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے۔ (2) شیخ کہتا ہے "باکس در میان منہ اگر چہ دوست
باشد" اور مولانا کہتے ہیں "بہ بیچ دوستی در میان منہ" پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست
سب سے راز کہنے کی ممانعت ہے مگر دوسرا بیان جب تک اس طرح نہ ہو "با دوست ہم
در میان منہ" تب تک اُس میں تعیم پیدا نہیں ہوتی۔ (3) شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی
ہے کہ اُس کے بھی دوست ہوں گے اور اُن دوستوں کے بھی دوست ہوں گے اور یہ سلسلہ
اس طرح چلا جائے گا۔ پس چپکے ہی چپکے راز جمہور میں پھیل جائے گا۔ مولانا نے یہ وجہ بیان
کی ہے کہ شاید دوستی میں غفلت آجائے اور دوست دشمن ہو جائے اگر چہ مطلب دونوں صحیح ہیں
لیکن پہلی وجہ زیادہ موجد ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں
فرق آجانا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ (4) شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعہ سے
بمرا تہ افضل اور فائق تر ہے۔ پہلی بیت میں اُس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق

خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی ہے وہ کہتا ہے:

خامشی بہ کہ ضمیر دلِ خویش با کے گفتن و گفتن کہ گوے

یعنی کسی سے اپنا بھید کہہ کر اُس کو افشائے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے اس لیے اب اُس کو ضبط راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔ پس اس سے خامشی ہی بہتر ہے۔ دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو خاطر خواہ دلنثیں کیا ہے۔ مولانا کے قطعہ میں کوئی خوبی اس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے اُسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے۔ مگر آن کے ساتھ لفظ افشا زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ ”از ان دم زنی“ کہ جگہ ”از افشائے آن دم زنی“ کہا گیا ہے اور قطعہ کا اخیر مصرعہ بھی حشو یا تکرار سے خالی نہیں ہے۔ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانا فی الحقیقت ایک ہی بات ہے۔ (5) قطعہ کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے جو فی الواقعہ سہل و ممتنع ہے۔ یعنی۔

سخنے در خلا نباید گفت کان سخن بر ملا نشاید گفت

یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا تو ناگفتنی باتیں کہنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تخیلیے میں گفتگو کر رہے ہیں اس سے اغیار مطلع نہیں ہو سکتے حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس بحرب اور سچے مضمون کو جو کسی قدر دقیق بھی تھا ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اُس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں۔ پھر خلا اور ملا اور در اور بر کا مقابلہ اور صنعت ذوقا فتمین اُس کے علاوہ ہے۔ مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی ”ہر بر سر بہر کہ اُفتد بخاطرت الخ“ اس میں پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو راز سر بستہ تیرے خیال یا دل میں گزرے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو پھر ”بموج بیانش نگاشتن“ کا لفظ ”اعہار آن“ کی جگہ لایا گیا ہے جس میں نہایت تکلف ہے۔ پھر اخیر مصرعہ میں ندامت کا لفظ شاید بے محل ہے کیونکہ اخفائے راز سے کبھی ندامت نہیں ہوتی۔ باوجود ان تمام باتوں کے دونوں مثالوں میں

شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ بمقابلہ گلستان کے الفاظ کے غریب معلوم ہوتے ہیں جیسے حدامتِ عہد، غائلہ، تعاہد، بسوج بیانش نکاشتن، غرامت۔

گلستان اور خارستان کا مقابلہ

خارستان: ہر کہ در گرتگی طاقت نیارو باید کہ
سہ یک شکم را از طعام پز کند و سہ یک دیگر از
آب و سہ یک دیگر از برائے نفس زدن رہا
کند۔ لہذا صوفیان وقت مامیگویند کہ تو ہمہ شکم
را از طعام پز گن آب خود چیز لطیف ست
خود را جائے میکند کہ لطیفان را جائے کم نباشد
و نفس را جائے گو مباحش۔

بیت

بشنو کہ چہ گفت صوفی پرواری
چون سیر شدی چراغیم جان داری

خارستان: علم با عمل پچو طعام بانمک ست
ہر کرا ہر دو ہست حکمے تمام دارد و طعام بے
نمک را چہ توان کرد۔

بیت

عمل بے علم تا مضبوط باشد
ہمیشہ شرط با مشروط باشد

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے بخوبی اندازہ

گلستان: حکیمان دیردیر خوردند و عابدان نیم
سیر۔ و زابدان تاسد رمتق۔ و جوانان تا طبق
برگیرند۔ و پیران تا عرق کنند۔ لہذا قلندران
چندان خوردند کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر
سفرہ روزی کس۔

بیت

اسیر بند شکم را دو شب تکمیرد خواب
شے ز معدہ ستگی شے ز لبتگی

مثال دوم

گلستان: عالم تا پرہیزگار کور مشعلہ دارست
بہدی بہ و ہو لا بہندی۔

بیت

بیفائدہ ہر کہ عمر در باخت
چیزے نخرید و زر بینداخت

کر سکتا ہے کہ خارتان کی عبارت گلستان کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور بے وقعت ہے اسی لیے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔

پریشان کا مصنف مرزا حبیب قاآنی کتاب مذکور کے خاتمہ کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اُس کی عمر تیس برس سے بھی دو تین برس کم تھی جب یہ کتاب اُس نے لکھی ہے۔ اور شیخ نے گلستان کو سن کبولت اور اوائل سن شیخوخت میں مرتب کیا ہے۔ پس اگر قاآنی سے گلستان کا پورا پورا تتبع نہ ہو سکا تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سرانجام کرنا جس کی بنا محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہیے شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان نا تجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قاآنی سے گلستان کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا کیونکہ اُس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشی کے سوا حقیقت اور واقفیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اُس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی تھی اسی قدر بیان حقائق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اُس سے سلب ہوتا جاتا تھا۔ قاآنی نے بھی گلستان کی طرح پریشان کی عبارت دلچسپ اور دلآویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے مگر سوا اس کے کہ تمام کتاب کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند آزاد اور بیباک نوجوانوں کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کر دیا اور کچھ اُس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمہ کتاب کے سوا جس میں اُس نے اپناے ملوک کے لیے چند پند کر کے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اکثر نہایت غلیظ فحش یا نحیف ہزل پر رکھتا ہے جس کے پڑھنے سے شرم آتی ہے اور طرہ یہ کہ پھر اُس سے نتائج عارفانہ اور متصوفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریشان کا خاتمہ جس میں شوخی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے باب ہشتم گلستان کے مقابلے میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام خاتمے میں شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بیشک عمدہ ہے مگر شیخ کی جاود بیانی کا کہیں نشان نہیں پایا جاتا۔ عام نصائح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اس قبیل کے ہیں: پند بادشاہ باید بہ سخن سخن چینان اعتماد نکند۔ پند بادشاہ باید دین را تو قیر کند و دشمنان دین را تحقیر فرماید۔ پند بادشاہ باید از خدا غافل نما ند تا خداے ازو غافل نباشد۔ پند بادشاہان را در نظام ممالک دست و رافشان بکارست و تیغ سرافشان۔

بیت

”تا کہ بدان دوستان شوند فراہم تا کہ بدین دشمنان شوند پریشان“

اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں حقیقت سے دور جا پڑتا ہے۔ مثلاً چند بادشاہ باید تو اضع کند و تکبر نفرماید کہ تو اضع صفتِ اتقیاست و تکبر صفتِ اشقیاست۔ ومن گفتہ ام اہل تکبر را در نطفہ غش ست چو سرکش صفتِ آتش ست و شیطان از آتش ست و اہل تو اضع را نطفہ پاکست چہ افتادگی صفتِ خاکست و آدم از خاک بود۔ اس بند کے پہلے حصے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصے میں جو اس نے کچھ ندرت پیدا کرنی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہو سکا۔ اسی مضمون کو شیخ علیہ الرحمۃ نے بوستان میں اس طرح بیان کیا ہے۔

| | |
|-----------------------------|------------------------------|
| زخاک آفریدت خداوند پاک | پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک |
| حریص و جہان سوز و سرکش مہاش | زخاک آفریدنت آتش مہاش |
| چو گردن کشید آتش ہولناک | بہ بیچارگی تن بینداخت خاک |
| چو آن سرفرازی نمود این کی | ازان دیو کردند ازین آدمی |

البتہ جو عذر کہ قاتنی نے پریشان کے دیباچے میں کیا ہے اور گلستان کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عذر ظاہر کیا ہے اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور گلستان کی قدر شناسی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے احباب کے نہایت سخت جبر سے پریشان کے لکھنے پر قلم اٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے ”کہ ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستان کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ میں نے کہا۔ بھائی تو بہ کر! میں! اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے کذاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا میں نے مانا کہ جگنورات کو چمکتا ہے لیکن کیا وہ چاندنی کی برابری کر سکتا ہے؟ شیخ کی گلستان ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہل معنی کی جان قیامت تک اس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم و نثر اور جڈ و ہزل ترتیب دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کر سکتی لیکن

اس کو بھی چارو تا چار اڑتا ہی پڑتا ہے۔

اب ہم چند ایسے فقرے گلستان اور پریشان سے انتخاب کر کے لکھتے ہیں جو متحد المضمون

ہیں۔

گلستان اور پریشان کا مقابلہ

پریشان : دخل سرچشمہ ایست و
مخارج جوے چند کہ آب سرچشمہ در
آنها جاری است و لاشک چون
سرچشمہ مسدود شود جوہا خشک شود
پس ہر کس آب در جو جاری خواهد
سرچشمہ را رعایت کند۔

ایضاً۔ خرج باندازہ دخل باید کرد نہ
آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم
چہ این معنی نامعقول است کہ بار
در پیش قدم باشد و بار گیر در حین عدم
باشد

قطعہ

الا اے آنکہ حاجت ست موجود
بکارت می نیاید دخل معدوم
شنیدستی کسے از بہر جولان
نشیند بر فراز اسپ موہوم

گلستان : اے فرزند دخل آب
روانست و خرج آسیاے گردان۔
یعنی خرج فراوان کردن مسلم کے
راست کہ دخل معین دارد

قطعہ

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن
کہ میگویند ملاحان رودے
اگر باران بکوہستان نبارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

اس مثال میں گلستان سے صرف ایک عبارت اور پریشان کے دو مختلف مقامات سے دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی گئی ہیں مگر شیخ کا بیان قافی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ بلیغ ہے لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں ان کا بیان کرنا اول تو مشکل ہے۔ دوسرے

یہ امید نہیں کہ ناظرین اُس کو غور سے دیکھیں گے۔ اسی لیے صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں۔ شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین بمقصد ہے۔ ایک تو اظہارِ شفقت جو ناصح کے لیے ضرور ہے۔ دوسرے یہ جتنا کہ نوجوان بھی اکثر اس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر دخل و خرج کی تشبیہ آبِ روان اور پن چلی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر زالی ہے اسی قدر چچی ٹلی بھی ہے۔ پن چلی بھی بدون آبِ روان کے نہیں چلتی اور خرج بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا۔ پن چلی بھی پانی کے بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے نہیں چلائی جاتی ہے تو اُس کی گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے۔ خرج بھی جو بدون آمدنی کے اندوختہ وغیرہ سے چلتا ہے بے بنیاد اور ناپائیدار ہوتا ہے پھر اس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لیے لکھا ہے۔ شیخ نے ان مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے ”یعنی خرج فراوان کردن مسلم کے راست کہ دخل معین دارد“ اس کے بعد قطعہ میں ایک نہایت بدیہی مثال دے کر بے بنیاد خرج کا مال ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اُس مقولے کو ملاحوں کی طرف منسوب کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملاجی گیتوں میں گائی جاتی ہے۔ قاآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو ندیوں سے تشبیہ دی ہے تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے مگر یہ شیخ کی اُس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اُس نے قطعے میں بیان کی ہے لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اُس کو ملاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قاآنی کو یہ بات نہیں سوجھی۔ پھر قاآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سرچشمے کے بند ہوتے ہی ندیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقع ایسا ہی ہوتا ہے جیسا شیخ نے لکھا ہے پھر شیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساکِ باران کی طرف مستند کیا ہے اور یہ کہا ہے ”و اگر باران کو ہستان نبارد“ اور قاآنی کہتا ہے کہ جو شخص ندی جاری رکھنی چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے یعنی اُس کو بند نہ ہونے دے حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے پھر قاآنی نے تمثیل سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رکھنا چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے۔ اگرچہ مطلب اس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے لیکن اس جگہ مقتضایہ مقام کے موافق اُس کو یہ کہنا چاہیے تاکہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرج جاری رکھنا چاہے

اُس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ تمثیل اسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ہے نہ اس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رکھنا چاہو تو سرچشمے کی خبر رکھو۔ دوسری عبارت کو قافی نے اس جملے سے شروع کیا ہے ”خرج باندازه دخل باید کرد“ اس کے بعد وہ کہتا ہے ”نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم“ یہ دوسرا جملہ اُس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے کیونکہ سنا گیا ہے کہ وہ اکثر جشن و عید وغیرہ کے موقعوں پر دخل موہوم یعنی قصائد کے صلے کی توقع پر قرض لے کر خرچ کر لیا کرتا تھا اور نہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہیے تھا ”نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار“ یا ”نہ آنکہ دخل شیخ باشد و خرج دہ“ یا اور اسی مضمون کا کوئی جملہ ہوتا کیونکہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم مخالف یہی مضمون ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا وہ مضمون فی نفسہ صحیح بھی نہیں ہے کیونکہ دخل موہوم کی امید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ہے۔ تمام تاجراور کاشتکار اور مدبران ملک دخل موہوم ہی کے بھروسے پر لکھو کھا رو پیہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر ایسے خرچ کو جو دخل موہوم کی امید پر کیا جائے موہوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ہونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ معدوم گھوڑے پر بے شک کوئی سوار نہیں ہو سکتا لیکن دخل موہوم کی امید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہزاروں آدمی خرچ کر سکتے اور کرتے ہیں۔

پریشان: کسانیکہ ظرافت و شوخی
بسیار کنند یا بغایت رقیق القلب
و وسیع الخلق باشند سرداری و سالاری
لشکر را نشانند۔ چہ این صفت موجب
جسارت لشکریان شود و گاہ باشد کہ
ہر چہ گوید بہ ظرافت و شوخی حمل کنند
و نیز اندک مہربانی و وسعت خلق لازم
ست کہ لشکریان را بیم حستن و بستن
نباشد، دور نیست کہ از بیم چشم و گوش

گلستان: خشم بیش از حد گرفتن
دشست آرد و لطف بیوقت ہیبت
برود نہ چندان درشتی کن کہ از تو سیر
گردند و نہ چندان نرمی کہ بر تو دلیر
ایہات
درشتی و نرمی بہم در بہ ست
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہست
درشتی نگیرد خردمند پیش
نہ سستی کہ نازل کند قدر خویش

بھوقی بادشاہ فراموش کنند و در
مخالفت ہم زبان شوند و در وقت کار
ستی کنند تا کار فاسد شود۔

مشہوری

کسے را کہ شد حکمران بر سپاہ
دو خصلت ہی داشت باید نگاہ
عتابے نہان اندر و صد خطاب
خطابے نہان اندر و صد عتاب
بہر نوش او نیش ہا جان گداز
بہر نیش او نوشا دلنواز
بیکدست شمشیر زہراب دار
بیکدست دریای گوہر غار

نظم

جوانے با پدر گفت اے خردمند
مرا تعلیم کن پیرانہ یک پند
بگفتا نیکردی کن نہ چندان
کہ گردد چیرہ گرگ تیز دندان

اس مثال میں گلستان اور پریشان کے مضمون میں کسی قدر فرق ہے۔ گلستان میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے اور پریشان میں لشکر کے افسروں اور سپہ سالاروں کی تخصیص ہے اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ نفس مضمون متحد ہے اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں۔ شیخ کا بیان لفظاً و معنآ قافی کے بیان سے بہر اہم فائق تر ہے۔ اول تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور تول ہے۔ جو قافی کے فقروں میں نہیں ہے نثر میں ایسا تناسب بشرطیکہ معنی مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے پرلے درجے کا کمال انشا پر دازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ رتبے کی شاعری ہے۔ شیخ کے چاروں فقروں میں الفاظ مقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنی مقصود کو ان سے اور زیادہ رونق ہو گئی ہے یعنی خشم اور لطف، بیش از حد اور بیوقت، وحشت اور ہیبت، آرد اور ہمد، درشتی اور نرمی کو جو فساد کی حالت سے تمثیل دی ہے وہ کیسی بلیغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے اور دوسری بیت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شعار بنا لیتا اور کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ پیش گرفتن سے مستفاد ہوتا ہے اچھا نہیں ہے کیونکہ عقلمند ایسا نہیں

کرتے اور بالکل نرمی ہی نرمی برتا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ سستی کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کہ نیکی بے محل کرنی نہیں چاہیے کیسے عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً چنداں کا قافیہ مناسب اور ہم وزن لانے کے لیے کس مطلب کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔ قافیہ کی نثر میں بمقابلہ شیخ کی نثر کے کوئی بات جو قابل ذکر ہو نہیں پائی جاتی۔ اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے۔ چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق تین معلوم ہوتا ہے اس لیے پریشان کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستان کے ذاتی محاسن کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابل لحاظ ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر گلستان کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے۔ ان میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

| | | | |
|---|--|----|--------------------------------------|
| 1 | ہر عیب کہ سلطان بہ پسند ہنرست | 8 | پرتو نیکان گنیرد ہر کہ بنیادش بدست |
| 2 | ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت | 9 | افعی راکشتن و بچاش را نگاہ داشتن کار |
| 3 | حاجت مشاطہ نیست روی دل آرام را | | خرد مندان نیست |
| 4 | ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر | 10 | پہر نوح با بدان ہنست |
| 5 | ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل | | خانمان ہوش گم شد |
| | دارد بگوید | 11 | دشمن نتوان حقیر و بیچارہ شرد |
| 6 | دو درویش در گھمے بخشید و دو بادشاہ دور | 12 | عاقبت گرگ زادہ گرگ شود |
| | اقلیے نہ کجھ | 13 | در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس |
| 7 | سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل | 14 | تو گمری بہ دل ست نہ بمال و بیزرگی |
| | چوں پُشد نشاید گذشتن بہ پیل | | بھقل ست نہ بمال |

- 15 دشمن چه کند چو مہربان باشد دوست
 16 حسود را چکنم کوز خود برنج درست
 17 قدر عافیت کسے دانند کہ بمصیبتے گرفتار آید
 18 آنا تکہ غنی ترند محتاج ترند
 19 چو عضوے بدرود آورد روزگار
 دیگر عضو ہار انماند قرار
 20 دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم
 21 گا ہے بسلا مے برنجند و گا ہے
 بد شنائے خلعت دہند
 22 ہر کجا ہشتمے بود شیرین
 مردم و مرغ و مور گرد آید
 23 راتھی موجب رضاے خداست
 کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست
 24 آزا کہ حساب پاکست از محاسبہ چہ پاک
 25 تو پاک باش برادر مدار از کس پاک
 ز زند جلمہ ناپاک گازران برسنگ
 26 تاتریاق از عراق آورده شود مار گزیدہ
 مردہ شود
 27 بہ دریا در منافع بیشمار ست
 و گر خوائی سلامت برکنار ست
 28 دوست آن باشد کہ گیر دوست دوست
 در پریشان حالی و در ماندگی
 29 در میر و وزیر و سلطان را
 بے وسیلت مگرد پیرامن
 سگ و دربان چو یافتند غریب
 این گریبان بگیرد آن دامن
 30 خداے راست مسلم بزرگی و الطاف
 کہ جرم بیند و نان برقرار میدارد
 31 بنیاد ظلم اول در جہان اندک بود ہر کہ
 آمد بران مزید کرد تا بدین غایت رسید
 32 ہر کہ با فولاد بازو پنچہ کرد
 ساعد سیمین خود را رنجہ کرد
 33 چو کردی با کلوخ انداز پیکار
 سر خود را بنا دانی شکستی
 چو سنگ انداختی بر روے دشمن
 حذر کن کاندر آہش نشستی
 34 کس نیاموخت علم تیر از من
 کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد
 35 در یاب کنون کہ نعمت ہست بدست
 کین دولت و ملک میرود دست بدست
 36 گر وزیر از خدا بترسیدے
 بچنان کز ملک ملک بودے

- 37 برگردن او بماند و بر ما بگذاشت
- 38 اگر شہ روز را گوید شب است این
باید گفت ایک ماه و پروین
- 39 جهان دیدہ بسیار گوید دروغ
- 40 چو کارے بے فضول من بر آید
مراد روے سخن گفتن نشاید
- 41 اگر روزی بد آنش بر فزودے
ز نادان تنگ تر روزی نبودے
- 42 محاسب را درون خانہ چکار
- 43 ہر کہ عیب دگران پیش تو آورد و شمرد
بیگمان عیب تو پیش دگران خواهد برد
- 44 یار شاطر من نہ بار خاطر
- 45 چو از قومے کیے بید آنشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را
- 46 من آنم کہ من دانم
- 47 گبے بر طارم اعلیٰ نشینم
گبے بر پشت پائے خود نہ بنیم
- 48 فہم سخن گر کند مستمع تو تہ طبع از شکلم بجوی
- 49 خانہ دوستان بر دہ و در دشمنان کلوب
- 50 درویش صفت باش و کلاہ تتری دار
- 51 نیک باشی و بدت گوید خلق بہ کہ
بد باشی و نیکت گویند
- 52 اگر دنیا نباشد در دمندم
و گر باشد بمہرش پائے بندیم
- 53 درویش ہر کجا کہ شب آمد سراے سلامت
پائے از زنجیر پیش دوستان بہ کہ
- 54 بابیگانان در بوستان
- 55 زن بد در سراے مرد نکو
بہرین عالم است دوزخ او
- 56 کوفتہ راتان چہی کوفتہ است
- 57 ادخویشتمن گم است کہ ار بہری کند
باطل است انچہ مدعی گوید
- 58 مرد باید کہ گیر داند رگوش
در نوشتہ ست پند برد یوار
- 60 خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی
- 61 اگر خاکی نباشد آدمی نیست
- 62 ہمراہ اگر شتاب کند ہمراہ تو نیست
- 63 خوے بد در طہیجے کہ نشست
زود جز بوقت مرگ از دست
- 64 حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن پائے مردی ہمسایہ در بہشت
- 65 خوردن ہر اے ز بستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ ز بستن از بہر خوردن است

- 66 نہ چندان بخور کز دہانت برآید
67 عطاے او بہ لقاے او کشیدم
68 ہر کہ نان از عمل خویش خورد
69 گریہ مسکین اگر پر داشتے
70 مور ہمان بہ کہ نباشد پرش
71 گفت چشم تنگ دنیا دار را
72 منعم بکوہ و دشت دیابان غریب نیست
73 شاہد آنجا کہ رود عزت و حرمت بیند
74 بہ از روے زیباست آواز خوش۔ کہ
75 رزق ہر چند بیگمان برسد
76 بدوز طمع دیدہ ہوشمند
77 مور چکان را چو بود اتفاق
78 صیاد نہ ہر بار شکارے ہبرد
79 گاہ باشد کہ یکے روز پلنگش ہبرد
80 گردن بے طمع بلند بود
81 این شکم بے ہنر بیچ بیچ
82 یکے نقصان مایہ و دوم شامت ہمسایہ
83 اگر از ہر دو جانب جاہلانند
84 مرا بخیر تو امید نیست بدمرسان
85 تو براویج فلک چہ دانی چیست
86 گر تو قرآن بدین نمط خوانی
87 بہری رونق مسلمانی
88 کلوئی با بدان کردن چنانست
89 سرمانداری سرخویش گیر
90 ناز بران کن کہ خریدارست
91 خطاے بزرگان گرفتن خطاست
92 چون تہمت شد اعتدال مزاج
93 زن جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند
94 تو بجائے پدر چہ کردی خیر
تا ہمان چشم داری از پیرت

- 95 اسپ تازی دو تک رود بشتاب
 96 خر عیسیٰ اگر بمکہ رود
 چون بیاید هنوز خر باشد
 97 میراث پدر خواهی علم پدر آموز
 98 اگر صد عیب دارد مرد در ویش
 رفیقانش کیے از صد ندانند
 دیگر یک تا پسند آید ز سلطان
 ز اقلیے بہ اقلیے رسانند
 99 ہر کہ در خردیش ادب کلند
 در بزرگی فلاح از ویر خاست
 100 ہر آن طفل کو جور آموزگار
 نہ بیند جفا بیند از روزگار
 101 جور استاد بہ ز مہر پدر
 102 چو دخلت نیست خرچ آہستہ تر کن
 103 کریمان را بدست اندر دم نیست
 خداوندان نعمت را کرم نیست
 104 پراگندہ روزی پراگندہ دل
 خداوند روزی بحق مشتغل
 105 گئے را گر کلونے بر سر آید
 ز شادی بر جہد کاین استخوان ست
 دیگر نھے دو کس بردوش گیرند
 نسیم الطبع پندارد کہ خوان ست
- 106 ہر جا کہ گلست خار ست
 107 منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنم
 منت شناس ازو کہ بخد مت بداشتت
 108 نہ محقق بود نہ دانشمند
 چار پائے برد کتابے چند
 109 پیش دیوار انچہ گوئی ہوشدار
 تا نباشد در پس دیوار گوش
 110 ہمہ کس عقل خود بہ کمال نماید و فرزند
 خود بہ جمال
 111 گراز بسیط زمین عقل منحدم گردد
 بخود گمان نہ برد بیچ کس کہ نادانم
 112 کہ حبث نفس نگر دو بسا لہا معلوم
 113 درشتی و نرمی بہم در بہ است
 چورگ زن کہ جراح و مرہم نہ است
 114 مشک آنت کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید
 115 اندک اندک شود بہم بسیار
 116 کہ بسیار خوار ست بسیار خوار
 117 بر رسولان بلاغ باشد و بس
 118 کہن جملہ خویش آراستن
 بہ از جملہ عاریت خواستن

یہ تمام مقولے جو نقل کیے گئے ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر تقریباً اسی قدر فقرے اور اشعار گلستان میں ایسے اور بھی ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں گلستان اور بوستان شائع ہوئی ہیں وہاں زیادہ تر ان کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر باز میچہٴ طفلان اور دستخوش کودکان رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سن و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اُس نے ان کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ بچوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار ان کو یاد رہ جاتے ہیں۔ پس جس قدر گلستان اور بوستان کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوک زبان ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغر سن کے لذت یاب ہو چکے ہیں۔ ورنہ اگر یہ کتابیں بھی سکسپیرز کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے میں رہتیں اور عورت اور مرد اور بوڑھے اور جوان سب لوگ ان کو دیکھا کرتے تو میں امید کرتا ہوں کہ گلستان کا ایک بڑا حصہ اور اُس سے کسی قدر کم بوستان کے اشعار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہو جاتے جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فرقہ اور گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو۔ الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور انداز بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے۔ سو یہ خاصیت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستان بوستان میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔

یہاں ہم گلستان کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستان کا حال لکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی تقریباً اسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستان اور اُس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اسی طرح جاری ہے جیسے گلستان کی۔ مثنوی میں فردوسی کو عموماً تمام شعر پر ترجیح دی گئی ہے اور

حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا موثر اور پُر جوش اُس کی قلم سے تراوش کرتا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا۔ لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگ و حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے اسی طرح اخلاق نصیحت و پند، عشق و جوانی، ظرافت و مزاح، زہد و ریاضت وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاہنامہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی یوسف و زلیخا اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے۔ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تعریف کرنے کے بعد مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ اُس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا دیکھا نہیں آتا جیسا کہ اور لوگوں کو آتا ہے یہ قصہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ”ہم کو لڑائی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اپنی تیغ زبان کو میان سے نکال کر تمام دفتر شعر و سخن پر قلم پھیر دوں۔“ اس کے بعد ایک حکایت شاعر صفا ہانی کی جنگ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت کا انکار نہیں ہو سکتا لیکن شاہنامے کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جتنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیاات کے مرغوب و نامرغوب ہونے میں الف و عادت کو بڑا دخل ہے۔ مرجع جس قدر عام ہندستانوں کو عادت مستمرہ کی وجہ سے مرغوب ہے اسی قدر اکثر غیر ملک والوں کو خلاف عادت ہونے کے سبب نامرغوب ہے۔ اکثر عطر ہم کو خوشگوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں اسی طرح لطف شعر جو کہ ایک وجدانی امر ہے بغیر الف و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس و دبیر کے مرعے جس پیرایے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اُس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا مشکل ہے یعنی ضرور ہے کہ کچھ بندگوار کی اور کچھ گھوڑے کی تعریف میں لکھے جائیں۔ کچھ بندایے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی تعلق اور فوقیت اوروں پر ظاہر ہو۔ یہ بھی ضرور ہے کہ مرثیہ مسدس میں لکھا جائے اور مسدس انھیں بحر میں سے کسی بحر میں ہو جو انیس و دبیر نے اختیار کی ہیں۔ پس جن خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے اُن کے

بغیر کسی کی رزمیہ نظم مقبول نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جو عربی الفاظ سے پاک ہو رزم لکھی جائے اور بیشمار الفاظ جن میں فردوسی نے تصرف کیا ہے اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کیے ہیں کبھی کبھی تصد اسی طرح برتے جائیں جیسے شاہنامے میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا ہوا ہے اشعار میں بہ تکلف داخل کیے جائیں۔ پس شیخ کی رزمیہ حکایت جو شیخ کے شاہنامے سے میل نہیں کھاتی اس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں میں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا۔ فردوسی نے بھی یہی مگر اختیار کیا تھا جس سے اُس کی مثنوی مقبول ہوئی۔ دقیقی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتا پ اور ارچا پ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو پسند آ چکی تھی۔ جب دقیقی وہ داستان لکھ کر دفعۃً مر گیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اُس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقیقی نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ دقیقی کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے۔ دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس حال سے واقف نہیں ہیں وہ اُس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً مساوی الاقدام ہیں شاہنامہ، سکندر نامہ، مثنوی معنوی اور بوستان، شاہنامے اور مثنوی معنوی کو سکندر نامے اور بوستان سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوشنویس کی بے ساختہ مشق کو اُس کے بنائے ہوئے اور مرتب کیے ہوئے قطعے سے ہوتی ہے۔ قطعہ اگر چہ رخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اُس کے اجزا میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار اور یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دوائر وغیرہ بے ساختہ اُس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوشنویس خود کوشش کرے تو قطعے میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے یہی سبب ہے کہ خوشنویس لوگ اگلے استادوں کی مشق کو اُن کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فردوسی اور مولانا روم نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کانت چھانٹ نہیں کی مگر باوجود اس کے صد ہا مقامات اُن سے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے۔

بوستان اور سکندر نامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقیح و تہذیب اور زحمت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعری کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ لیکن دونوں کے اندازِ بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے سکندر نامے میں شاعرانہ مبالغہ، زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، طُرُقِ استعارات، تنوعِ تمثیلات، ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور شاندار باتیں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بوستان میں نہایت سادگی، الفاظ کی نرمی اور گھلاہٹ، ترکیبوں کا سلجھاؤ، بیان کی صفائی، عبارت کی دلنشینی، خیالات کی ہمواری، مبالغہ میں اعتدال، ماخذ میں سہولیت، حسن ترتیب، لطیف ادا، تمثیلات کی برجستگی، استعارات کی لطافت، کنایات کی شوخی، باوجود صنعتِ شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی ہوئی ہے۔ مولانا نظامی سکندر

نامے میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

| | |
|---------------------------|----------------------------|
| فلک در بلندی زمین در مخاک | یکے طشت خون شد یکے طشت خاک |
| بہشت برین ہر دو آلودہ طشت | ز خون سیاوش بے سر نوشت |
| زمین گر بضاعت برون آورد | ہمہ خاک در زیر خون آورد |

یہی مطلب سکندر نامے میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

| | |
|-------------------------------|--------------------------------|
| کہ داند کہ این دغمہ دام و دو | چہ تار تہنجا دارد از نیک و بد |
| چہ نیرنگ با بخر دان ساخته است | چہ گردن کشان را سر انداختہ است |

شیخ نے اسی مطلب کو بوستان میں یوں بیان کیا ہے۔

| | |
|---------------------------|------------------------------|
| زدم تیشہ یک روز بر تل خاک | گیوش آدم تالہ دردناک |
| کہ زنہار گر مردی آہستہ تر | کہ چشم و بنا گوش دروہست و سر |

یہی مطلب بوستان میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

| | |
|-----------------------------|------------------------------|
| درین باغ سرے نیامد بلند | کہ باد اجل بخش از بن بکند |
| عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت | کہ چندین گل اندام در خاک خفت |

قناعت کی ترغیب سکندر تارے میں اس طرح دی ہے۔

تو نیز ار نہی بار گردن ز دوش
 چو دریا بسرماۓ خویش باش
 بہمانی خویش تا روز مرگ
 چو پینہ ز برگ کسان خورد گاز

ز گردن کشان بر نیاری خروش
 ہم از بود خود سوہ خود بر تراش
 درختے شو از خویشتن ساز برگ
 ہمہ تن شد آفتشت و قے کرد باز

بوستان میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے۔

شنیدم کہ در روزگار قدیم
 مپنداری این قول معقول نیست
 چو طفل اندرون دارد از حرص پاک
 خبر ده بدرویش سلطان پرست
 گدا را کند یکدرم سیم سیر
 گدائے کہ بر خاطرش بند نیست
 بخشند خوش روستائی و جفت

شدے سنگ بر دست ابدال سیم
 چو قانع شدی سیم و سنگت یکمیت
 چہ مشیت زرش پیش و چہ مشیت خاک
 کہ سلطان زدرویش مسکین ترست
 فریدون بملک عم نیم سیر
 بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست
 بذوقے کہ سلطان در ایوان بخشت

مال اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر تارے میں اس طرح کی گئی ہے۔

میکن گول گرچہ عار آیدت
 خرے بر گریوہ ز سختی ببرد
 یہی مضمون بوستان میں اس طرح ادا کیا گیا۔

کہ ہنگام سرما بکار آیدت
 کہ از کابلی جلن با خود نبرد

بہ دختر چہ خوش گفت بانوی ده
 ہمہ وقت پُر دار مشک و سیوے

کہ روز نوا برگ سختی بند
 کہ پیوستہ درده روان نیست جوے

سکندر تارے میں عہد شباب پر تھمر اس طرح کیا گیا ہے۔

جوانی شد و زندگانی نماند
 جوانی بود خوبی آدمی
 چو پے ست و بوسیدہ شد استخوان
 غرور جوانی چو از سر گذشت

جہان گو ممان چون جوانی نماند
 چو خوبی رود کے بود خرمی
 دگر قصہ خور وئی نخوان
 ز گستاخ کاری فرد شوی دست

بہی چہرہ باغ چندان بود
 چو باد خزانہ در افتد باغ
 بود برگ ریزان چو شاخ بلند
 ریاضین ز بُستان شود ناپدید
 بنال اے کھن بلبل سال خورد
 دوتا شد سہی سرو آراستہ
 چو تاریخ پیچہ درآمد بسال
 سر از بارنگی درآمد بسنگ
 فروماند دستم ز سے خواستن
 تم گوئے لاجوردی گرفت
 ہیون رونده زره ماند باز
 همان بور چوگانی باد پایے
 طرب را ز میخانہ گم شد کلید
 بوستان میں یہی مضمون ایک حکایت کی ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

چو باد صبا بر گلستان و زد
 چمد تا جوان ست و سرسبز و وحید
 بہاران کہ بار آورد بید مشک
 نہ نہ بہد مرا با جوانان جمید
 بقید اندرم جرہ بازے کہ بود
 شماراست نوبت برین خوان نشست
 چو بر سر نشست از بزرگی غبار
 مرا برف بارید بر پر زاغ
 کند جلوہ طاؤس صاحب جمال
 مرا غلہ نیک آمد اندر درو
 حمیدین درخت جوان را سزد
 فلکتہ شود چون بہ زردی رسید
 بریزد درخت کہن برگ خشک
 کہ بر عارضم صبح پیری دمید
 دمام سر رشتہ خواہد ربود
 کہ ما از معمم ہشتیم دست
 دگر چشم عیش جوانی مدار
 نشاید چو بلبل تماشائے باغ
 چہ میخوانی از باز برکنده بال
 شما را کنون میدم سبزہ نو

گلستان ما را طراوت گذشت
مرا تکیہ جان پدر بر عصاست
مسلم جوان راست بر پائے جست
گل سرخ رویم نگر ز زتاب
ہوس بختن از کودک تا تمام
مرا سے ببايد چو طفلان گریست
نکو گفت لقمان کہ تا زیستن
ہم از با مدوان در کلبہ بست
جوان تا رساند سیاہی بنور
کہ گلدستہ بند چو پشمرده گشت
دگر تکیہ بر زندگانی خطاست
کہ پیران برند استعانت بدست
فرو رفت چون زرد شد آفتاب
چنان زشت نبود کہ از پیر خام
ز شرم گناہان، نہ طفلانہ زیست
بہ از سالہا بر خطا زیستن
بہ از سود و سرمایہ دادن ز دست
بزد پیر مسکین سپیدی بگور

مذکورہ بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ سہل الماخذ ہوتے ہیں۔ وہ معنی مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے جو ہمیشہ خاص و عام کے مشابہے میں آتی ہیں۔ بخلاف مولانا نظامی کے کہ ان کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں ہوتیں۔

شیخ نے جو شاعر صفاہانی کی حکایت میں اپنا رزمیہ بیان دکھایا ہے اگرچہ بے تکلفی اور سادگی میں فردوسی کے بیان سے نہیں ملتا لیکن مولانا نظامی کی رزم سے جس میں سادگی کی نسبت شاعری کا زیادہ لطف ہے بہت مشابہت رکھتا ہے چند شعر اس حکایت کے اور ان کے ہم مضمون اشعار سکندر نامے کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

سکندر نامہ

دو لشکر چو مور و ملخ تا خمد
نبرد جہان در جہان ساحند
بشمیر پولاد و تیر خدنگ
گذرگاہ بر مور کردند ننگ
کنند اژدہاے مسلسل شکنج
دہن باز کردہ بتاراج سخن

بوستان

دو لشکر بہم برزدند از کمین
تو گشتی زدند آسمان بر زمین
ز باریدن تیر بچون نگرگ
بہر گوشہ برخاست طوفان مرگ
بھید ہزیران مدخاش ساز
کنند اژدہاے دہن کردہ باز

| | |
|-------------------------------|-----------------------------|
| زمین کو بساطے بُد آراستہ | زمین آسمان شد ز گرد کپود |
| غبارے شد از جاے برخاستہ | چو انجم درو برق شمشیر ص خود |
| برانگیخت رزے چو بارندہ مغ | چو ابر اسپ تازی بر انجم |
| گنگر گش ز پیکان و باران ز تیغ | چو باران پلارک فرو رتخیم |

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملادینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے۔

شیخ علی حزیں نے جس کو ہندستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں بیس بائیس صفحے کی ایک مثنوی جس کا نام خرابات ہے بوستان کی طرز میں لکھی ہے اور اپنی عادت کے موافق اُس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے چنانچہ مثنوی کے خاتمے میں فرماتے ہیں۔

| | |
|------------------------------|-----------------------------|
| خن خج گر ہست ہشیار مغز | کند قوت جان این گہرہائے فقر |
| ازین نامہ گردون بُد آوازہ شد | روان خن گستران تازہ شد |
| نوائے کہ این خامہ بنیاد کرد | دل طوسی رودکی شاد کرد |
| گبوش نظامی اگر میرسید ق | سرودے ازین خسروانی نشید |
| بہ تعظیم من رُخ نہادی بخاک | کہ احسنت اے نیر تابناک |
| دگر سعدی شہد پرور ادا ق | شنیدے ز صور نے من نوا |
| ساعش ز سر عقل بردے و ہوش | زبان مہر کردے شدے جملہ گوش |

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزیں نے اپنے نزدیک اس مثنوی میں بوستان کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اُس کو اپنے لیے ایک سرمایہ نازش سمجھتا تھا۔ سوانح عمری میں اسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ ”بسیارے از مطالب عالیہ و سخنان دلپذیر در آن کتاب بسک نظم در آمد“ مگر دونوں کتابوں یعنی بوستان اور خرابات کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں۔ ایک جاندار دوسری بے جان، لفظ اچھے، بیان اچھا، مطالب عمدہ، یہ سب کچھ سہی۔ مگر شیخ کے بیان میں ایک چھپا ہوا جادو ہے جو بوستان کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ قسط کا بیان ایک جگہ بوستان میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے۔ ہم دونوں

کے اشعار اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور فرق جو دونوں کے طرز بیان اور طریقہ ادا میں ہے اُس کو بھی کسی قدر بیان کریں گے۔

| خرابات | بوستان |
|---|---|
| <p>شندیم کہ در عہد بہرام گور نمود از قضا قحط سالے ظہور چو صحراے محشر زمین تف گرفت بہ در یوزہ آسمان کف گرفت سحاب سیہ دل نشد مہربان بحال لب تھنہ خاکیان بخیلی نمود ابر بر کائنات بہمد زمین سوخت طفل نبات ز خشکی در اندام خاک دوتوہ عروق شجر شد چو رگہای کوه ز تاب فروزندہ مہر بلند زمین بحر و دانہ بودش سپند بط سے چو پستان بے شیر شد ز خشکی چو پیکان گلو گیر شد</p> | <p>چنان قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاران فراموش کردند عشق چنان آسمان بر زمین شد بخیل کہ لب تر کردند زرع و نخیل بخوشید سر چشمہای قدیم نماند آب جز آب چشم یتیم نبودے بجز آہ بیوہ زنی اگر بر شدے دودے از روزنی چو درویش بے برگ دیدم درخت قوی بازوان ست و در ماندہ سخت نہ بر کوه سبزی نہ در باغ شیخ ملخ بوستان خورد و مردم ملخ</p> |

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرعے میں جس حسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے اس سے بہتر کوئی اسلوب بیان خیال میں نہیں آتا۔

قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اس ایک مصرعے میں ہوئی ہے ”کہ یاران فراموش کردند عشق“ سہل و ممتنع کا لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے وہ اسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنف سے بھی ویسا بیان نہ ہو سکے۔ اس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں یہ اسلوب اُن سب سے علیحدہ ہے قحط کی سختی ہمیشہ اس طرح بیان کی

جاتی ہے 'ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہو گئی، آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے۔ ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا۔ لاکھوں جاندار بھوکے مر گئے۔ غرضیکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلہ کی گرانی، پانی کی نایابی، بھوک کی تکلیف اور اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں۔ شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے زالا اور سب سے بلیغ ہے۔ اس اسلوب سے اُس کو یہ جتنا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے لوگ اُس کو بھول گئے تھے۔ اور یاران کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنف بھی اسی عشاق کے جرگے میں تھا۔ دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ مینہ نہ برسا تھا۔ مگر اُس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تیسرے شعر میں پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اُس سے مستثنیٰ کرنا۔ چوتھے شعر میں کسی گھر کے روزن سے باورچی خانہ کے دھوئیں کا نہ نکلنا اور پھر اُس سے رائیوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنیٰ کرنا۔ پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں۔ چھٹا شعر بلاغت اور حسن بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے جیسا پہلا۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا، درختوں کا سرسبز نہ ہونا، چشموں اور نڈیوں کا خشک ہو جانا، تیسوں کا رونا، گھروں میں کھانا نہ پلنا، بے وارث رائیوں کے آہ و نالے، درختوں کا بے برگ و بار اور غریبوں کا بے سرو سامان ہونا، پہلوانوں اور زبردستوں کا در ماندہ ہو جانا، پہاڑ اور جنگل میں سبزہ اور ہریا دل کا نہ رہنا، نڈیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا نڈیوں کو کھانا، یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر کم و بیش ظہور میں آتی ہیں۔

حزب نے باوجود اس کے کہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے بوستان سے پانچ سو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اُس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے اپنی پوری طاقت شیخ کے تتبع میں صرف کی ہے کوئی کرشمہ اُس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا جس کو دیکھ کر جی بے اختیار پھڑک اٹھے۔

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے اُس میں کوئی خوبی قابل ذکر نہیں۔ دوسرے شعر میں

زمین تفتہ کو صحراے محشر سے تشبیہ دینا تعریف اشیٰ بالمجہول کے قبیل سے ہے یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہل دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ صحراے محشر اور تمام اعتقادات خود تمثیل کے محتاج ہیں ان پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی۔ تیسرا شعر بوستان کے اُس شعر سے ماخوذ ہے جو ذوالنون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔

خبر شد بہ مدین پس از روز پست کہ ابر سیہ دل بر ایشان گریست
مگر اتا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رونے سے تعبیر کیا ہے جس سے ترحم اور برساندوں باتیں نکلتی ہیں اور حزیں نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے جس سے دونوں معنی ویسے صاف نہیں نکلتے۔ چوتھا شعر شیخ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

چنان آسمان بر زمین شد بخیل کہ لب تر کردند زرع و نخیل
مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرت ناک ہے بہ نسبت اس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جائے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت عمدہ مگر پہلا مصرعہ تکلف سے خالی نہیں۔ شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں۔ پس اندام اور دو تودہ کے لفظ کو افادہ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگلیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اُس پر ڈالا جاتا تھا وہ سپند کا حکم رکھتا تھا۔ پس فروزندہ اور باز جو دو صفتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں انھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ فروزندہ مہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ مہر بلند کہنے سے اُس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں۔ ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلاف عادت اور خلاف مقتضائے مقام ہے۔ نہ قحط کا یہ خاصہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمے کے لکھا ہے اس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے اور نہ بوستان کو خراباات سے افضل ثابت کرنا مد نظر ہے

کیونکہ نہ ہم شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی بے عیب ہو جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلے میں لائی جاتی ہے جو اس سے بہتر اور فائق ہو تو اس میں بیسیوں فروگزاشتیں اور تصور نظر آنے لگتے ہیں اگر خراباات بوستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسن اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزیں کے بیان میں چون و چرا کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آتا کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامۃ الورد ہیں۔

اب ہم گلستان اور بوستان کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو ان کے مقبول ہونے میں بہت بڑا دخل ہے۔
مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی کہیں صرف گلستان سے اور کہیں صرف بوستان سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیں گی۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان میں سرتاپا اخلاق اور تہذیب نفس کے مضامین مندرج ہیں مگر میرے نزدیک ان کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواضع کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا اخلاق میں بیسیوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستان اور بوستان میں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو مگر کوئی کتاب ان دونوں کتابوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قبول عام کا مدار زیادہ تر حسن بیان اور لطف ادا پر ہے نہ کہ نفس مضامین پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیت میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لیے جو محاسن ان کتابوں کے ہم آگے لکھنے چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حسن معنی اور اسلوب بیان سے متعلق ہوں گے۔

(1) سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ان دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ ان کتابوں میں اس قدر کم ہیں کہ چند مقامات مستثنیٰ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانہ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو۔ اور یہ امر ایسی ہدانی کتابوں میں جن کے زمانہ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ گزر

چکے ہیں کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خاصہ ہے ان کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعرا کے کلام میں سچ اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزا ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں مثلاً شیخ بوستان میں کہتا ہے

میان دو کس دشمنی بود و جنگ سر از کبر بریکدگر چون پنگ
ز دیدار ہم تا بحدے رمان کہ بر هر دو جنگ آمدے آسمان

دوسری بیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے کہ جب کبھی راہ میں دو چار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اُس وقت کمالِ نفرت سے اُن کا جی چاہتا تھا کہ آسمان جو سامنے حائل نظر آتا ہے اُس کو توڑ کر نکل جائیں۔ یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت ایسا نہیں ہے کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے۔ پس جس طرح ادنیٰ درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں۔

اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا مثلاً گلستان میں ایک دولت مند بخیل کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔ دو مالدارے راشنیدم کہ بہ بخل چنان معروف بود کہ حاتم طائی بہ سخاوت۔ ظاہر حالش بہ نعمت دنیا آراستہ و خستِ نفس در نہادش بچمان متمکن۔ تا بجائیکہ تانے را بجانے از دست ندادے و گر بہ ابو ہریرہ را بہ لقمہ نواختے و سب اصحاب کہف را استخوانے نینداختے۔ فی الجملہ کسے خانیہ اور اندیدے در کشادہ و سفرۂ اور اسر۔

بیت

درویش بجز بوی طعاش نشمیدے مرغ از پس نان خوردن اور بیزہ نچیدے
ایک اور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اس طرح کیا ہے۔ ”ہمگین آبے کہ
مرغابی دروایمن نبودے“ اگر غور سے دیکھئے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے۔ مگر بادی النظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ہوتی۔

سو پر نیچرل یعنی فوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جن سے قدیم اور متوسط

زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے ان کتابوں میں بہت کم ہیں۔ تمام گلستان اور بوستان میں صرف دو تین حکایتیں ایسی ہیں جو اس زمانے میں مستبعد معلوم ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد اُن میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا۔

علم اخلاق کے بعض اصول جن میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اب بھی چلا جاتا ہے اگر کسی کتاب میں زمانہ حال کے فلسفہ مسلمہ کے برخلاف ہوں تو اُس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ہو۔ مثلاً شیخ کے اس فقرے پر کہ ”دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فنہ انگیز“ اکثر مشنری لوگ یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس بحث کے متعلق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصہ نقل کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک علمی سوسائٹی میں چند یوروپین عالم اور مشنری موجود تھے۔ راستی اور دروغ پر ایک مضمون پڑھا گیا۔ جس میں گلستان کے فقرہ مذکورہ کی تائید کی گئی تھی۔ ایک پادری صاحب نے کہا کہ مضمون عمدہ ہے مگر جس قدر اس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے اُس میں سے نکال دینا چاہیے۔ اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ آخر ہمارے دوست جو اس قصے کے راوی ہیں انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ اس بحث کا محاکمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے تو بیشک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بیشک سچ بولنے سے بہتر ہے اس کے بعد انھوں نے یہ مثال دی کہ 1857ء میں جو اکثر لوگوں نے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یوروپین عورتوں اور بچوں کو ظالموں اور بے رحموں کی شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں چھپا لیا تھا اور باغی لوگ اُن کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے اُن کا حال پوچھتے تھے ایسی حالت میں جھوٹ بول کر اُن بے گناہوں کو خطرے سے بچانا بیشک سچ بولنے سے بہتر تھا۔ اس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا۔ مذکورہ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اُس نے گلستان کے آٹھویں باب میں اپنے ذاتی اغراض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت بُرا بتایا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے

گر راست سخن گوئی و در بند بمانی بہ زانکہ در وقت دہد از بند رہائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ ”صورت مفروضہ میں بھی مقتضائے جو انمردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں اُن مظلوموں پر ثار کیا جائے جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب اُن مظلوموں کی باری آئے تو آئے۔“ لیکن ہمارے نزدیک جیسی تک جو انمردی ہے کہ ظالموں کے مقابلہ کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے اُن بے گناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو ورنہ یہ حرکت تہور اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی۔ اسی طرح شیخ کے اس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔

شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کے ناکس بتر بیت نشود اے حکیم کس
کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث اور فضول اور بے کار ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلت بدل جاتی ہے یا نہیں۔ علم اخلاق کے اُن مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے ایک روشن ضمیر مورخ کی رائے ہے کہ حال کی سویل سیشن نے انسان کے اخلاق پر اس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں مگر گناہ بدستور موجود ہیں پہلے زمانے میں بیشک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلت سے نہیں ملتا۔

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ”یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے شریف نہیں ہو سکتا“ فی الواقع اس سے کمال تعجب پایا جاتا ہے مگر اس پر کوئی مہذب سے مہذب بھی اعتراض نہیں کر سکتا ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے آریا نے ہندستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے دور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی بایں ہمہ شائستگی و تہذیب، نو بلٹی یا شرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں۔

ایک اور جگہ گلستان میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک مریض بادشاہ کے لیے چند حکماء یونان نے آدی کا پتہ جو خاص صفات سے موصوف ہو تجویز کیا تھا مگر تجربے کی نوبت

نہیں آئی یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر شیخ اس اعتراض سے بری ہے اس کا الزام جو کچھ ہے مجوزین پر ہے۔ نہ اُن کی تجویز کے راوی پر۔ شیخ پر البتہ اُس صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا کہ وہ اُن کی تجویز کو پسند کرتا۔ یا یہ لکھتا کہ اُس سے بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ یا جو فرض معلمین اخلاق کا ہے (یعنی ہر قصے اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا) اُس سے عہدہ برآ نہ ہوتا۔

بعض ملا یا نہ اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سُنے گئے ہیں۔ مثلاً اُس نے گلستان میں کہا

ہے

رہ راست برد اگر چہ دورست زن بیوہ مکن اگر چہ حورست

اس پر بعض حضرات یہ نقص وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اُس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ اور بعضے کٹ ملا بیوہ کی جگہ بیوہ¹ بتاتے ہیں جس کے معنی اُنھیں کو معلوم ہیں یہ ویسا ہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا "شعر مرابدرسہ کہ برد" ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستان کوئی فقہ کا فتاویٰ نہیں ہے کہ جس کی ہر امر و نہی کو ہر امر و نہی مصطلح فقہا پر محمول کیا جائے وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اُس کی ترغیب دیتا ہے اور جس کو مضر سمجھتا ہے اُس سے منع کرتا ہے۔ گو فقہانے اُس کو مباح لکھا ہو۔ کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے رہی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ہے۔ سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثبوت پر ثابت ہوتی ہے۔

(2) سب سے زیادہ معقول اعتراض بوستان کی اُس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے سومنات کا قصہ لکھا ہے مگر ہم نے اُس کی بابت پہلے باب میں کچھ عذر لکھے ہیں جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہو سکتے ہیں۔

امر پرستی کا ذکر جو ان کتابوں میں اکثر آتا ہے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس باب میں جو کچھ ہم نے خاتمہ کتاب میں لکھا ہے وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ہو۔

1- بیوہ کے معنی لغت میں متجہ داور متغیر ہونے کے لکھے ہیں جو اس شعر میں کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتے۔

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اس کے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت میں فرق آئے اور زیادہ ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ کپڑا جس قدر اُجلا ہوتا ہے اسی قدر جلد ذرا سے دھنے سے میلا ہوتا ہے۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں اور آج کل بھی کہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ہے اسی طرح مشرقی سلسلہ تعلیم کا جزو اعظم ہیں ان کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرعے کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے مشنریوں نے صرف اس وجہ سے کہ ان میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئی ہیں اور ایسے مضامین کا سلسلہ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے خلاف ہے۔ ان پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے طولانی ریویلوکھ کر چھپواے ہیں۔ نیز اس لحاظ سے کہ ان کتابوں کو زیادہ تر صغیر سن بچے پڑھتے ہیں اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلاشبہ اس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ زمانہ متوسط میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا۔

دوسری عام اور بڑی خوبی جو ان کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے وہ شیخ کا انداز بیان ہے جس کا ملکہ اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ یہ بات نہ قواعدِ علمِ بلاغت کی پابندی سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی استاد کی تعلیم سے آتی ہے بلکہ جس طرح حسن صورت اور حسن صوت قدرتی خوبیاں ہیں اسی طرح حسن بیان بھی ایک جنمینی خاصہ ہے جس میں اکتساب کو چنداں دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور کمال موقوف ہے۔ جو مطلب اُس کو بیان کرنا ہوتا ہے اُس کے لیے وہ ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ ڈھونڈ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے ”الصمت زینة العالم و بستر الجاهل“ (یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل کی پردہ پوش) اس مطلب کو وہ شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

ترا خامشی اے خداوند ہوش وقارست و نا اہل را پردہ پوش

اگر عالمی ہیبت خود مبر وگر چاہی پردہ خود مذر

یا مثلاً اُس کو بیان کرتا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سنتے وہ آخر کو پچھتاتے ہیں یا زک

اُٹھاتے ہیں۔ اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے ”ہر کے نصیحت نشو و نما سے شہین دارڈ“ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا ہے کہ ہر شے کی قدر اُس کے کم یا ب ہونے سے ہوتی ہے۔ اس کو وہ اس طرح لکھتا ہے ”اگر شبہا ہمہ شب قدر بودے شب قدر بے قدر بودے“ یا مثلاً اُس کو یوں بیان کرتا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ہے۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ”ہر کہ بادانا ترے از خود مجادلہ نماید تا بدانند کہ داناست بدانند کہ نادان است“ یا مثلاً اس مطلب کو سب پیٹ کی خاطر سختی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اس عنوان سے بیان کرتا ہے ”اگر جو رشک نبودے بیج مرغ درد ام نیفتادے بلکہ صیاد خود دام نہ نہادے“ یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھیمہ ہو جاتا ہے اس طرح بیان کرتا ہے۔ ”ہمہ کس را دندان بہ ترشی کند گرد مگر قاضیان را بشرینی“ یا مثلاً اس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذتوں کو ترک کرنا بُرا ہے وہ اس اسلوب سے ادا کرتا ہے ”ہر کہ ترک شہوت از بہر قبول خلق دادہ است از شہوت حلال در شہوت حرام افتادہ است“ یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ و زاری سے قضاے الہی نہیں بدلتی اور قانون قدرت نہیں ٹوٹتا۔ اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے

قضا دگر نشود در ہزار نالہ و آہ بہ شکر یا بہ شکایت بر آید از دہنے
 فرستے کہ وکیل ست بر خزانہ باد چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے
 یا اُس کو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکار یہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہنچائے گی۔
 اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے۔

ترسم نزی بہ کعبہ اے اعرابی کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستانست
 کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اُسے بیان کرنا ہے ایک واقعے کی صورت میں بیان کر کے اُس کو زیادہ پُر تاثیر اور دلنشین کر دیتا ہے مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزار ہا امیدیں اور ارمان دل میں لیے ہوئے مر گئے اسی طرح ایک روز ہم تم بھی مرجائیں گے اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

شنیدم کہ یکبار در وجلہ سخن گفت با عابدے کلہ
 کہ من فر فرماندی داشتم بسر بہ کلاہ مہمی داشتم
 پہرہم مد کرد و نصرت وفاق گرفتہم بہازوے دولتِ عراق

طمع کردہ بودم کہ کرمان خورم کہ ناگہ بخوردند کرمان سرم
 بکن پنبہ غفلت از گوش ہوش کہ از مردگان پندت آید بگوش

اخیر کے شعر سے اُس نے یہ بات جنادی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپڑی نہیں بولی تھی بلکہ یہ صرف بیان کرنے کا پیرا یہ ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

یکے جہود و مسلمان خلاف می جستند چنانکہ خندہ گرفت از نزاع ایشانم
 بہ طنز گفت مسلمان گر این قبلہ من درست نیست۔ خدایا جہود میرانم
 جہود گفت بہ توریت میخورم سوگند وگر خلاف کنم ہچو تو مسلمانم
 گر از بسط زمین عقل منعدم گردد بخود گمان نبرد ہچ کس کہ نادانم

یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلآویز نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس پیرائے نے اُس کو دلآویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ امن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور خود داری کو ہاتھ سے نہ دے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

دو کس گردد دیدند و آشوب و جنگ پراگندہ نعلین و پرندہ سنگ
 یکے فتنہ دید از طرف بر شکست یکے در میان آمد و سر شکست
 کسے خوشتر از خویشتم دار نیست کہ باخوب و زشت کشش کار نیست

یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے وہ ایک بڑی جواہد ہی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے۔

آن شنیدی کہ صوفیے می کوفت زیر نعلین خویش منجے چند
 آستینش گرفت سرہنگے کہ بیا نعل بر ستورم بند

اس میں پیرا یہ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا درجے کی برتی ہے یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا جو ایک مذموم خصلت ہے اس کا الزام صرف فقیروں ہی پر نہیں بلکہ دولت مندوں پر بھی ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

”خواہندہ مغربی در صنف بزازان حلب میگفت اے خداوندان نعمت اگر شمار انصاف

بودے ومارا قناعت رسم سوال از جهان برخاستے“ یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اُس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

| | |
|----------------------------|----------------------------|
| یکے قطرہ باران زا برے چکید | خجل شد چو پہناے دریا بدید |
| کہ جائیکہ دریا ست من کیستم | گر او ہست حقاً کہ من عیستم |
| چو خود را بچشم حقارت بدید | صدف در کنارش بجان پرورید |
| پہرش بجائے رسانید کار | کہ شد نامور لولوے شاہوار |
| بلندی بدان یافت کو پست شد | در نیستی کوفت تا ہست شد |

یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسلوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں اُسی طرح رند لوگ پارسلوگ کی صحبت سے گھبراتے ہیں۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

| | |
|-------------------------|--------------------------|
| زاہدے در میان رندان بود | زان میان گفت شاہدے بلخی |
| گر ملولی زما ترش منشین | کہ تو ہم در میان ما تمنی |

کبھی وہ اپنے ہی کلام کو اور کا مقولہ قرار دے کر نہایت باعزاز کرتا ہے جیسے۔

| | |
|---------------------------|------------------------------|
| دو یتیم جگر کرد روزے کباب | کہ مے گفت گویندہ با رباب |
| دریغا کہ بے ما بے روزگار | بروید گل و بشکفد نو بہار |
| بے تیرودے ماہ اردی بہشت | بیاید کہ ما خاک با شیم و خشت |

یا جیسے

| | |
|-----------------------------|--------------------------|
| چو دخلت نیست خرج آہستہ ترکن | کہ میگویند ملاحان سرودے |
| اگر باران بکوہستان نبارد | بسالے دجلہ گردد خشک رودے |

یا جیسے۔

| | |
|-----------------------------|--------------------------|
| ہچنان در فکر آن یتیم کہ گفت | پہلبانے بر لب دریائے نیل |
| زیر پایت گر بدانی حالی مور | بچو حال تست زیر پائے پیل |

یا جیسے

چہ خوش گفت با کودک آموزگار کہ کارے نکر دیم و شد روزگار
یا جیسے

آن شنیدی کہ شاہدی بہ نہفت با دل از دست دادہ می گفت
تا ترا قدر خویشتم باشد پیش چہ قدر من باشد

(3) ان دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفی ہیں با ایں ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستان کی مثال دی جاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کی کمال انشا پر دازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

شاعر اور فنی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ہے تو اُس کے کلام میں خواہی نخواستہ ہی بناوٹ اور تکلف پیدا ہو جاتا ہے اور سررشتہ حسن معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ شیخ نے صنائع لفظی و معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں ساختگی اور تصنع کا گمان نہیں ہوتا مگر وہ ان عارضی نمائشوں کا ایسا پابند نہیں ہے کہ اُن کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ہو جائے جہاں الفاظ مساعدت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اس کی بھی دے دیتا ہے۔ اُس کی نثر میں مسجع اور مرصع فقرے سادے فقروں میں ایسے طے ہوئے ہیں۔ جیسے پشمینے کی مثال میں ریشم کے تار۔ جب تک خاص توجہ سے نہ دیکھا جائے تمام فقرے یکساں اور ہموار معلوم ہوتے ہیں البتہ بعض حکایتوں میں اُس نے صنائع لفظی و معنوی کی زیادہ رعایت کی ہے جیسے ساتویں باب کی اُنیسویں حکایت جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تو نگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے مگر اُس میں بھی الفاظ کو حسن معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا۔ جس قدر اُس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حسن انتظام پایا جاتا ہے اُس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیت اور واقعیت موجود ہے۔ حکایت مذکور کے چند متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ”تو مگر ان دخل مسکینا نند۔ و ذخیرہ گوشہ نشینان۔ و مقصد زائران و کہف مسافران۔ و تمحل بارگران۔ از بہر راحت و گران دست بہ طعام آنگہ برند کہ متعلقان و زبردستان بخورند۔ و فعلہ مکارم ایشان بہ اراطل و ایام

و پیران و اقارب و حیران برسند.....¹ از معدہ خالی چه قوت آید۔ و از دست تہی چه مروت زاید۔ و از پائے بستہ چه سر آید۔ و از دست گرسنہ چه خیر..... فراغت با فاقہ نمی پیوندد۔ و جمعیت با تنگدستی صورت نہ بندد۔ یکے تحریمہ عشا بستہ۔ و دیگرے منتظر عشا نشستہ۔ این بدان کیے ماند..... اشارت خواجہ عالم بفقیر طائفہ ایست کہ مرد میدان رضا اند۔ و تسلیم تیر قضا۔ نہ اینان کہ خرقة ابرار پوشند و قلمہ ادرار نوشند..... مشغول کفاف از دولت عفاف محروم ست۔ و ملک فراغت زیر تکلیف رزق معلوم.....

..... گفت چندان مبالغہ در وصف ایشان بکردی۔ و سخباے پریشان بگفتی کہ وہم تصور کند تریاقت۔ یا کلید خانہ ارزاق۔ شتے متکبر و مغرور۔ و معجب و نفور۔ مشتغل مال و نعمت۔ و مفتتن جاہ ثروت۔ سخن گویند الا بسفاہت و نظر نکند الا بکراہت۔ علمارا بگدائی منسوب کنند۔ و فقرار اہ بے سرو پائی معیوب گردانند۔ بہوت مالے کہ دارند۔ و غیرت جائے کہ پندارند۔ برتر از ہمہ نشینند۔ و خود را بہتر از ہمہ شناسند۔ نہ آن در سردارند کہ سر یکے فرود آرند۔ بنیجر از قول حکما کہ گفتہ اند "ہر کہ بطاعت از دیگران کم ست و بہ نعمت بیش۔ بصورت تو نگر ست و بمعنی درویش۔..... گفتیم مذمت ایشان روا مدار کہ خداوند کرم اند۔ گفت غلط کردی کہ بندگان درم اند۔ چه فائدہ کہ ابر آذرند۔ و بر کس نمی بارند۔ و چشمہ آفتابند و بر کس نمی تابند۔ و بر مرکب استطاعت سوارند۔ و نمیرانند۔ و قد سے بہر خدا نہ نہند۔ و در سے بے من و اذئی نہ ہند۔ مالے بمشقت فراہم آرند۔ و بہ خست نگہدارند و بہ حسرت بگذارند۔ چنانکہ بزرگان گفتہ اند "سیم بنیل و قحے از خاک بر آید کہ بنیل بہ خاک در آید..... گفتش بر بخل خداوندان نعمت و قوف نیافتہ الا بعلت گدائی۔ و گر نہ ہر کہ طمع یکسو نہد کریم و بخیلش یکے نماید۔ محک داند کہ زر چیست۔ و گد داند کہ مسک کیست۔..... مجال عقل ست کہ اگر ریگ بیابان دُر شود۔ چشم گدایان پُر شود۔..... ہرگز دیدہ دست دعا نے بر کف بستہ۔ یا بعلت بینوائی در زندان نشستہ یا پردہ مصوے دریدہ۔ یا کفے از معصم بریدہ الا بعلت درویشی۔ شیر مردان را بکلم ضرورت در نقب ہا گرفتہ و کعب ہا سفتہ..... اغلب حمیدستان دامن عصمت بمعصیت آلایند و گرسنگان نان مردم ربایند۔

1- (.....) یہ نشان اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

بیت

چون سب درندہ گوشت یافت نہ پرسد کین شتر صالح ست یا اثر دجال
 گفتا نہ۔ کہ من بر حال ایشان رحمت می برم۔ گفتم نہ۔ کہ بر مال ایشان حسرت
 بخوری۔ ہر بیذقے کہ بر اندے بد فح آن کوشیدے۔ و ہر شاہے کہ بخواندے۔
 بفرزین پوشیدے تا نقد کیہ ہمت در باخت۔ و تیر چہہ جت ہمہ بنذاخت ہر جا کہ
 گلست خارست و باخر خمار۔ و بر سر گنج مار۔ و آنجا کہ دُر شاہوارست۔ نہنگ مردم خوار۔ لذت
 عیش دنیا را لدغہ اجل در پیش ست۔ و نعیم بہشت را دیوار مکارہ در پیش نظر نہ کنی در
 بستان کہ بید مشک ست و چوب خشک۔ ہم چنین در زمرہ تو نگران شاگرد و کفور۔ و در حلقہ
 درویشان صابرند و ضحور۔ مقربان حضرت حق جل و علا تو نگرانند درویش سیرت۔ و
 درویشانند تو نگر ہمت۔ مہین تو نگران آنست کہ غم درویشان بخورد۔ و بہین درویشان آن کہ کم
 تو نگران گیرد۔ نعم طائفہ ہستند بدین صفت کہ بیان کردی۔ قاصر ہمت۔ و کافر نعمت۔ کہ
 ببرند و بہند و نخورند و ندہند۔ توے برین نمط ہستند کہ شنیدی و طائفہ خوان نعمت نہادہ و
 صلای کرم در دادہ و میان بخدمت بست۔ و ابرو بہ تواضع کشادہ طالب نامند و مغفرت۔ و
 صاحب دنیا و آخرت۔

(4) شیخ اکثر ان کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظتِ بلغ کے
 کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو۔ پھر اپنے حُسنِ بیان سے تمام حکایت کو نہایت
 لطیف و بلغ کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ یا لطیف کنایہ
 ایزاد کر کے اُس میں نونِ مریح لگا دیتا ہے تاکہ پند و موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دور
 ہو جائے۔ چنانچہ گلستان کے خاتمہ میں اُس نے لکھا ہے۔

غالب گفتار سعدی طرب انگیز ست و طہیت آمیز۔ و کوتہ نظر ان را بدین علت زبان
 طعنہ دراز کہ ”مغز دماغ بیہودہ بُردن و دود چراغ بے فایده خوردن کار خردمندان نیست۔“
 لیکن برائے روشن صاحبِ دلان کہ روی سخن در ایشانست پوشیدہ نمائند کہ دُر موعظت ہائے صافی
 در سلکِ عبارت کشیدہ ست و داروی تلخ نصیحت بشہد ظرافت آمیختہ۔ تا طبع طول انسان از
 دولت قبول محروم نہماند۔“ جو ظرافت اُس نے بوستان اور گلستان میں برتی ہے وہ اکثر نہایت

سنجیدہ اور معقول ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی فیک پڑے ہیں جو قانونِ شرم و حیا سے کسی قدر متجاوز ہیں۔ لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد و عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ تحریر و تقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح زک نہیں سکتی۔

گو رو تاب مستوری ندارد چو در بندی سراز روزن بر آرد
اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں۔

مثال: (1) مہمانِ پیرے بودم در دیار بکر کہ مال فراوان داشت و فرزندے خوبرو۔ شے حکایت کرد کہ ”مرادر ہمہ عمر جز این فرزند نبوده است درختے درین وادی زیارت گاہ است کہ مردمان بحاجت خواستن آنجا روند۔ شبہاے دراز در پائے آن درخت بحق نالیدہ ام تا مرا این فرزند نکسیدہ“ شنیدم کہ پسر بارفیقان ہی گفت ”چہ بودے اگر من آن درخت را بدانتسے کہ کجاست تا دعا کردے کہ پدرم زودتر بمیرد“ خواجہ شادی کنان کہ پسر عاقل ست و پسر طعنے زن کہ پدرم فرقت لا یعقل۔

قطعہ

سالاہا بر تو بگذرد کہ گذر نہ کنی سوے تربتِ پدرت
تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہمان چشم داری از پدرت

مثال: (2) پیر مردے را حکایت کنند کہ دخترے خواستہ و حجرہ بگل آراستہ و مخلوت با او نشستہ و دیدہ و دل درو بست۔ شبہاے دراز نختے و بذلہا و لطیفہا گفتے باشد کہ موانست پذیرد و وحشت نگیرد۔ بالجملہ شے مے گفت ”بخت بلندت یار بود و چشم دولت بیدار کہ بہ صحبت پیرے افتادی پختہ، پروردہ، جہان دیدہ، آرمیدہ، نیک و بد جہان آزمودہ، سرد و گرم روزگار چشیدہ، کہ حق صحبت بدانند و شرط مودت بجا آرد، مشفق و مہربان، خوش طبع و شیرین زبان۔

مشوی

تا تو انم دلت بدست آرم در بیازاریم نیازم
 در چو طوطی شکر بود خورش جان شیرین فدائی پرورش
 نہ گرفتار آمدی بدست جوئے متعب، خیرہ رائے، سر تیز، سبک پاپے، کہ ہر دم "ہوست
 پزد، و ہر شب جائے تشہد، و ہر روز یارے گیرد۔

قطعہ

جو انان خرم اند و خوب رخسار و لیکن در وفا با کس نپایند
 وفاداری مدار، از بلبلان چشم کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند
 برخلاف پیران کہ بہ عقل و ادب زندگانی کنند۔ نہ بمختصائے جبل و جوانی۔

بیت

ز خود بہترے جوی و فرصت شمار کہ با چون خودی گم کنی روزگار
 گفت چندان کہ برین نمط بگفتم گمان بردم کہ دلش در قید من آمد و صید من شد۔ تا گاہ
 نفسے سرد از دل ہد در آورد و گفت کہ چندین سخن کہ گفتی در ترا زوی عقل من وزن آن یک
 سخن مدار کہ وقتے شنیدہ ام از قابلہ خویش کہ گفت "زن جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند بہ کہ
 پیرے" فی الجملہ امکان موافقت نبود بمفارقت انجامید۔ چون مدت عدتہش بسر آمد عقد نکاحش
 بستند با جوئے تند، ترش روے، تہیدست بد خوے، جور جفا میدید، ورنج و عنای میکشید و شکر نعمت
 حق بچکان میگفت: کہ الحمد للہ از ان عذاب الیم برہیدم و بدین نعمت مقیم رسیدم۔

قطعہ

با تو مرا سوختن اندر عذاب بہ کہ شدن با و گرے در بہشت
 بوے پیاز از دہن خو بروی خوب تر آید کہ گل از دست زشت

مثال (3)

مرا حاجیے شانہ عاج داد کہ رحمت بر اخلاق حجاج باد
 شنیدم کہ بارے سگم خواندہ بود کہ از من بنوعے دلش ماندہ بود
 بیند ختم شانہ کین استخوان نمی بایدم دیگرم سگ نخوان

مہندار چون سرکہ خود خورم کہ جوہ خداوندِ حلوا برم
 قناعت کن اے نفس براند کے کہ سلطان و درویش بنی کیے
 چرا پیش خرد بجاخت روی چو یکسو نہادی طمع خسروی
 یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرعے ہیں رحمت کا لفظ کنایتاً بجائے نفرین اور اس
 کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے۔ کیونکہ شعرا کے نزدیک حاجیوں کی سنگدلی، قسوت اور تکبر
 وغیرہ صفات ذمیرہ مسلم ہیں۔ چنانچہ گلستان میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا۔
 ازمن بگوے حاجی مردم گزای را کو پوشتین خلق بہ آزار میدرد
 حاجی تو نیستی شترست از برائے آنکہ بیچارہ خار میخورد و بار می برد
 ایک اور شاعر کہتا ہے۔
 چون عاٹے کہ دل ز در بیخا نہ جمع کرد حاجی ستم بخلق خدا بیشتر کند

پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اس کنایہ میں ہے وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی۔ اکثر
 ناواقف لوگ اس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مگر حکایت کا مضمون جس
 سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے حقیقی معنی سے آیا کرتا ہے۔

مثال (4) بازگانے رادیدم کہ صد و پنجاہ شتر بارداشت۔ و چہل بندہ خدمتگار۔ شبے در جزیرہ
 کیش مرا بہ حجرہ خویش برد۔ و ہمہ شب نیارمید از سخباے پریشان گفتن کہ ”فلان
 انبارم بترکستان ست۔ و فلان بضاعت بہندستان۔ و این قبائل فلان زمین ست و
 فلان مال را فلان کس ضمین۔“ گاہ گفتم کہ خاطر اسکندر یہ دارم کہ ہوایش خوش ست۔
 و باز گفتم نہ کہ دریاے مغرب مشوش ست۔ سعد یا سفرے دیگر در پیش ست۔ اگر آن
 کردہ شود بقیت عمر بگوشہ نشینم۔ گفتم آن کد ام سفرست۔ گفت ”گوگرد پاری بہ چین
 خواہم بردن کہ شنیدم کہ قیمت عظیم دارد۔ و از انجا کاسہ چینی بروم برم۔ و دیباے
 رومی بہ ہند۔ و پولاد ہندی بکلب۔ و آگینہ حلیمی بہ یمن۔ و بردیمانی پارس۔ از ان پس
 ترک سفر کنم و بدکانے نشینم۔“ چندا نے ازین مالحو لیا فرو گفت کہ بیش طاقت گفتش
 نہاند۔ گفت سعدی تو ہم سخنے بگواز آنہا کہ دیدی و شنیدی۔ گفتم:

نظم

آن شنیدستی کہ وقعہ تاجرے
گفت چشم تنگ دنیا دار را
در بیابانے بیخدا از ستور
یا قناعت پُکنہ با نازک گور

مثال (5):

ملک صالح از بادشاہان شام
بکشتے در اطراف بازار و کوی
کہ صاحب نظر بود در ویش دوست
دو در ویش در مسجدے خفته یافت
شب سردشان دیدہ تا بردہ خواب
یکے زان دو میگفت با دیگرے
گر این بادشاہان گردن فراز
در آیند با عاجزان در بہشت
پیشہ برین ملک و ماواہی ماست
ہمہ عمر ازینان چہ دیدی خوشی
اگر صالح آنجا بدیوار باغ
چو مرد این سخن گفت و صالح شنید
دے رفت تا چشمہ آفتاب
ردان ہر دو کس را فرستاد و خواند
بر ایشان بہارید باران جوہ
پس از رنج سرماؤ باران و سیل
گدایان بے جامہ شب کردہ روز
یکے گفت از اینان ملک را نہان
پسندیدگان در بزرگی رسند
برون آمد صمد با غلام
برسم عرب نیمہ بر بستہ روی
ہر آن کین دودار دملک صالح اوست
پریشان دل و خاطر آشفت یافت
چو حربا تا مثل کنان ز آفتاب
کہ در روز محشر بود داوڑے
کہ در لہو و عیش اند و با کام و ناز
من از گور سر بر نگیرم زخشت
کہ بہد غم امروز بر پائے ماست
کہ در آخرت نیز زحمت کشی
در آید بکفشش بدرم دماغ
دگر بودن آنجا مصالح ندید
ز چشم خلائق فروشت خواب
بہ ہیبت نشست و نثرمت نشاند
فروشت شان گرد ذل از وجود
نشستند با نامداران خیل
معطر کنان جامہ بر عود سوز
کہ اے حلقہ در گوش حکمت جهان
زما بندگانت چہ آمد پسند

شہنشاہ ز شادی چو گل بر شگفت
من آنکس نیم کز غرور حشم
تو ہم با من از سر بنہ خوی زشت
من امروز کردم در صلح باز
چنین راہ گر مقبلی پیش گیر
بر از شاخ طوبی کسے بر نداشت
ارادت نداری سعادت مجوی
ترا کے بود چون چراغ التہاب
وجودے دبد روشائی مجمع
مخندید در روے درویش و گفت
ز بے چارگان روے در ہم کشم
کہ تا سازگاری کنی در بہشت
تو فردا کن در برویم فراز
شرف بایدت دست درویش گیر
کہ امروز تخم ارادت نہ کاشت
بجوگان خدمت توان برد گوئی
کہ از خود پڑی بچو قندیل زاب
کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

(5) وہ اکثر نہایت پاکیزہ اور لطیف نکتے جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں ایسی

معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں۔

مثال (1): "ہر نفسے کہ فرو میرد مدّ حیات ست و چون برمی آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفسے دو نعمت موجود ست و بہر نعمتے شکرے واجب"۔ یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں سانس کی انسان کی زندگی اور تفریح کے باعث ہیں سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے۔

مثال (2):

چو طفل اندرون دارد از حرص پاک
چہ مشت زرش پیش و چہ مشت خاک
یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچہ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کو سونے اور مٹی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹی کو برابر جاننا جو کہ اعلا درجے کے عرفا اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے۔ بچہ کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے۔ کیونکہ سونے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا جس تک باقی رہتا ہے جب تک حرص اور طمع پیدا نہیں ہوتی۔ پس ایک شاعر نے کہ فلسفی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔

مثال (3):

اذان کز تو ترسد ہنس اے حکیم وگر با چو او صد بر آئی بچک
اذان مار بر پائے را می زند کہ ترسد سرش را بکوبد بستک

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زبردست بھی زیر دستوں پر غالب آجاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرہ اے پر چل جاتا ہے۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنا چاہیے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

مثال (4):

دہ کہ گر مردہ باز گردیدے بمیان قبیلہ و پیوند
رد میراث سخت تر بودے وارثان را ز مرگ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرگ خویشاوند سخت مصیبت ہے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس دینا اُس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا۔

اس طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگدشتوں سے ایسے نادر اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دے کر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دے کر اُس سے لی جاسکتی ہے۔ پس جو لوگ عمر کو عیش شیریں میں برباد کر دیتے ہیں شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے۔ یا مثلاً میں ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عید گاہ میں گیا۔ اتفاقاً خلقت کے ہجوم میں باپ سے پھڑ گیا میں اسی حالت میں رو رہا تھا کہ باپ نے آکر دفعۃً میرا کان مروڑا اور فرمایا ”میں نے تجھ کو بارہا کہا کہ میرا دامن پکڑے رہا کر مگر تو نہیں مانتا“ سچ ہے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا اسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دھگیری کے منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے اس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا نام لینا روانہ نہیں

ہے یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اینٹھ کر کہا کہ ”تالایق! میں نے تجھ کو کلباڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی، مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی“ اسی طرح زبان ذکر اور شکر کے لیے بنی ہے لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی۔ یا ”ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا دوسرے نے اُس کو جھڑک دیا کہ خبردار جو مسجد میں قدم رکھا۔“ میرا دل یہ بات سن کر بھرا آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ہے دامن آلودہ لوگ نہ جا سکیں گے۔

(6) حُسنِ تاویل اور لطفِ استدلال جیسا جچاٹلا اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے ایسا اور شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

مثال (1):

شنیدم کہ در روزگار قدیم شدے سنگ در دستِ ابدال سیم
 نہ پنداری این قول معقول نیست چو قانع شدی سیم و سنگت یکیت
 یعنی یہ جو مشہور ہے کہ اگلے زمانہ میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے۔
 اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں اُن کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک امر خارق عادت کو کس حسنِ بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت کیا ہے۔

مثال (2):

| | |
|-----------------------------|----------------------------|
| رہ عقل جز بیچ در بیچ نیست | بہ عارفان جز خدا بیچ نیست |
| توان گفتن این با حقائق شناس | دلے خوردہ گیرند اہل قیاس |
| کہ پس آسمان و زمین چوستند | بنی آدم و دام و ود کیستند |
| پسندیدہ پرسیدی اے ہوشمند | گویم گر آید جوابت پسند |
| کہ ہامون و دریاؤ کوہ و فلک | پری آدمی زاد دیو و ملک |
| ہمہ ہرچہ ہستند زان کمترند | کہ با ہستیش نام ہستی برند |
| عظیم ست پیش تو دریا بہ موج | بلندست گردون گردان بہ اوج |
| دلے اہل صورت کجا پے برند | کہ ارباب معنی بملکے درند |
| کہ گر آفتاب بست یک ذرہ نیست | و گرفت دریاست یک قطرہ نیست |

جو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم درکشد
یہاں اُس نے وحدت وجود کے اصلی معنی جو کہ اہل نظر کی سمجھ سے بالاتر تھے نہیں
بتائے۔ بلکہ ایک اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان
کیے ہیں کہ کوئی اور نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا۔

مثال (3):

گمہدار فرصت کی عالم دی ست دے پیش دانا بہ از عالمے ست
سکندر کہ بر عالمے حکم داشت دران دم کہ بگذشت و عالم گذشت
میتر نبودش کزد عالمے ستانند و فرصت دہندش دے
یہاں اُس نے دو متضاد دعوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے۔
دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک عالم سے بہتر ہے۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل
سے ثابت کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا
رہا تو معلوم ہوا کہ اسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اُس کو تمام عالم کے عوض
میں نہ مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا۔ یہ غایت درجے کا حسن
استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی شگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل
سے ثابت کیے جائیں اور حسن شعری بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

(7) نیچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی الواقع لاثانی ہے۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے
متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ اُن کو ویسے
پاکیزہ اور دلنشین بیان کے ساتھ ادا کر سکے۔ اُس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر
سابق آتا ہے۔

شعر

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
مثال (1):

گر از حق نہ توفیق خیرے رسد کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد
زبان را چہ بنی کہ اقرار داد بہ بین تا زبان را کہ گفتار داد

| | |
|----------------------------------|------------------------------|
| در معرفت دیدہ آدمی ست | کہ بکشاہ بر آسمان و زمی ست |
| کیت فہم بودے نشیب و فراز | گر این در نکر دے بروے تو باز |
| سر آورد و دست از عدم در وجود | درین جود بہاد در وے سجود |
| وگر نہ کے از دست جود آمدے | محالست کز سر سجود آمدے |
| ہکمت زبان داد و گوش آفرید | کہ باشد صندوق دل را کلید |
| اگر نہ زبان قصہ برداشتے | کس از سر دل کے خبر داشتے |
| وگر نیستے سعی جاسوس گوش | خبر کے رسیدے بسططان ہوش |
| مرا لفظ شیرین خوانندہ داد | ترا سمع دزاک دانندہ داد |
| مدام این دو چون حاجبان بر در اند | ز سلطان بہ سلطان خبر می برند |
| چہ اندیشی از خود کہ فعلم نکوست | ازان در نگہ کہ تقدیر او ست |
| برد بوستان بان بہ ایوان شاہ | بہ تحفہ شمر ہم ز ایوان شاہ |

اس نظم میں اُس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور زبان، کان، آنکھ، سر اور ہاتھ جن ظاہری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ اغراض بیان کیے ہیں۔ یہ تمام باتیں کم و بیش ہر شخص کو معلوم ہوتی ہیں مگر جس ترتیب سے شیخ نے اُن کو بیان کیا ہے اُس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم ہوتا ہے۔ اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو کہ بادشاہ ہی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جاتا ہے تمثیل دے کر مضمون کا حسن انتہا کو پہنچا دیا ہے۔

مثال (2):

| | |
|-------------------------------|---------------------------|
| دو صد مہرہ در یکدگر ساخت | کہ گل مہرہ چون تو پرداخت |
| رگت در سست اے پسندیدہ خوی | زمینے درو سید و شصت جوے |
| بصر در سر و فکر و رائے و تمیز | جوارج بدل دل بدائش عزیز |
| بہائم برد اندر افتادہ خوار | تو ہچون الف بر قدمہا سوار |
| نگون کردہ ایشان سر از بہر خور | تو آری بجزت خورش پیش سر |

نہ زبید ترا با چنین سروری کہ سر جز بطاعت فرود آوری
مثال (3):

شب از بہر آسائش تست و روز مہ روشن و مہر گیتی فروز
صبا از برائے تو فراش دار ہے گسترا ند بساط بہار
اگر باد و برفست و باران و مہغ وگر رند چوگان زند برق تیغ
ہمہ کارواران فرمان برند کہ تخم تو در خاک سے پرورند
وگر تشنہ مانی ز ختی مجوش کہ سقائے ابر آبت آرد بدوش
ز خاک آورد رنگ و بوے و طعام تماشا گو دیدہ و مغز و کام
عسل دادت از نخل و من از ہوا رطب دادت از نخل و نخل از نوا
ہمہ نخلندان بخائند دست ز حیرت کہ نخلے چنین کس نہ بست
خور و ماہ پروین برائے تو اند قنادیل سقف سرائے تو اند
ز خارت گل آورد و از نافہ مشک زرازکان و برگ تراز چوب خشک
بدست خودت چشم و ابرو نگاشت کہ محرم پہ اغیار نتوان گذاشت
توانا کہ آن نازمین پرورد بالوان نعت چنین پرورد
بجان گفت باید نفس بر نفس کہ شکرش نہ کار زبان ست و پس

(8) وہ اکثر قانون قدرت سے اشیاء کے حسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسام استدلال کی نسبت زیادہ دلنشین اور عام فہم ہوتا ہے کلام الہی میں بھی مبداء و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے۔
مثال (1):

پلیدی کند گر بہ بر جائے پاک چو ز شمش نماید پوشد بہ خاک
تو آزادی از نا پسندیدہا متری کہ بروے قد دیدہا
نبی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول و براز کرتی ہے اس کو فوراً
مٹی سے ڈھا تک دیتی ہے۔ اس سے وہ اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ نہ اسے اعمال کو ہمیشہ

لوگوں سے چھپانا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کی برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

مثال (2):

علم شتر چنانکہ معلوم ست اگر طفلے مہارش گیر دو صد فرسنگ بر د گردن از متابعت او نہ
بچد۔ اما اگر را ہے ہولناک پیش آید کہ موجب ہلاک باشد و طفل آنجا بنادانی خواهد رفتن زمام
از کفش در گسلاند۔ و بیش متابعت نکند کہ ہنگام درشتی ملاطفت مذموم ست۔

قطعہ

کسیکے لطف کند با تو خاک پایش باش و اگر ستیزہ کند در دو چشمش آنگن خاک
سخن بلطف و کرم با درشت خوی گوی کہ زنگ خوردہ نگر در مگر بسوہن پاک
یہاں اُس کو یہ سو جھانا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک دوسری طرف
سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو ورنہ مذموم ہے۔ اس مطلب پر وہ یہ دلیل لایا
ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچہ اُس
کی تکمیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لے جاتا ہے مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اُس کی
اطاعت نہیں کرتا اور رشتی توڑا کر بھاگ جاتا ہے۔

مثال (3):

برہ بر یکے پیشم آمد جوان کہ سے آرد اندر پیست گو سفند
بدو گفتم این ریسمانست و بند چپ و راست پونیدن آغاز کرد
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد کہ جو خوردہ بود از کف مرد و جید
برہ در پیش ہیچنان میدوید مرا دید و گفت اے خداوند راے
چو باز آمد از عیش و بازی بجایے کہ احسان کندیست در گردش
نہ این ریسمان میبرد با منش نیارد ہے حملہ بر پیلبان
بہ لطفے کہ دیدست بیل دمان کہ سگ پاس دارد چونان تو خرد
بدان را نوازش کن اے نیک مرد کہ مالذ زبان بر پنیرش دو روز
بران مرد کند ست دندان یوز یہاں اُس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی

کر دے اسی قدر لوگ تمہارے دوست اور خیر خواہ و جان نثار ہوں گے۔ اس پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ بکری، ہاتھی، کتا، چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جو شخص اُن کی پرورش کرتا ہے اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اسی کا دم بھرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبقت باقی نہیں رہتی۔

(9) وہ کبھی فقیمانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تلخ اور بے مزا اور سامعین کے دل پر گران ہوتی ہیں، اُنہیں بلکہ اکثر آزادانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں۔ لیکن حد شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے اُن کو زاہد اور رندوں کو پسند کرتے ہیں۔

مثال (1):

| | |
|----------------------------------|------------------------------|
| برہنگ سلطان چنین گفت زن | کہ خیز اے مبارک در رزق زن |
| برو تا زخوانت نصیبی دہند | کہ فرزند گانت بہ سختی درند |
| بگفتا بود مطبخ امروز سرد | کہ سلطان بشب نیت روزہ کرد |
| زن از ناامیدی سر انداخت پیش | ہے گفت با خود دل از فاقہ ریش |
| کہ سلطان ازین روزہ گوئی چه خواست | کہ افطار او عید طفلان ماست |
| خورندہ کہ خیرش بر آید زدست | بہ از صائم الدہر دنیا پرست |
| مسلم کے را بود روزہ داشت | کہ در ماندہ را دہد نان چاشت |
| وگر نہ چه حاجت کہ زحمت بری | ز خود باز گیری و ہم خود خوری |

مثال (2):

| | |
|---------------------------|------------------------------|
| شنیدم کہ مردے براہ حجاز | بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز |
| چنان گرم رو در طریق خداے | کہ خار مغیلان نہ کندے ز پائے |
| باخر ز وسواس خاطر پریش | پسند آمدش در نظر کار خویش |
| بہ تلبیس ابلیس در چاہ رفت | کہ نتوان ازین خوبتر راہ رفت |
| عرش رحمت حق نہ دریافتے | غرورش سر از جاہہ بر تافتے |
| یکے ہاتف از غیب آواز داد | کہ اے نیکبخت مبارک نہاد |

مہندار گر طامح کردہ کہ نزلے درین حضرت آوردہ
 بہ احسانے آسودہ کردن دلے بہ از الف رکعت بہر منزلے

(10) جب اُس کو کسی خاص فرقہ یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو اُن کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اُس کو یہ منظور تھا کہ امرا اور دولت مندوں کو اُن کے عیوب سے مطلع کرے تو اُس نے اس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی مناظرہ اور ایک اور شخص کا جس میں اپنے تئیں امرا کا طرفدار اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حمایتی قرار دیا ہے لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طرف ثانی امیروں کی برائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور شیخ اُس کی تقریر کو رد کر کے امرا کی خوبیاں اور درویشوں کی بُرائیاں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے تمام سلاطین عہد اور وزرا اور امرا کی خاطر خواہ خبر لی ہے۔ چنانچہ گلستان کے ساتویں باب میں یہ مناظرہ موجود ہے یا مثلاً اُس کو مشائخ و زبَاد کی قلعی کھولنی منظور تھی اس مضمون کو اُس نے کھلم کھلا ادا نہیں کیا بلکہ ایک قصہ جو بوستان کے چوتھے باب میں مذکور ہے نقل کیا ہے جس کا ما حاصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا۔ صاحب خانہ کے پاس اُس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا۔ سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اُس کی اور اُس کے ساتھ تمام فقرا اور تمام مشائخ کی تفضیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے۔ جتنے واقعی عیب اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں سب ظاہر کر دیے۔ جب شیخ صاحب اُن کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اس مقولے پر ختم کرتے ہیں۔

نخواہم درین باب ازین پیش گفت کہ شعت بود سیرت خویش گفت
 یعنی میں اس باب میں اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہوگی ”اپنا گھٹنا کھولے اور آپ ہی لا جوں مرے۔“ کیونکہ آپ بھی اسی گروہ میں سے ہیں پھر اُس بزرگ کی تواضع اور تحمل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زبان درازیوں کے اُس نے کچھ بُرا نہ مانا اور اُس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا۔

(11) یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ

اتنے موثر نہیں ہوتے جتنا کہ اپنی سرگذشت اور روداد کا بیان موثر ہوتا ہے بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سُنی جاتی ہے اُس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سُنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگذشت کو بہ نسبت اخبار ماضیہ کے زیادہ پُر جوش الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ گلستان اور بوستان میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور اُن سے نتائج استخراج کیے ہیں اس لیے اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان اُن کو بیان کرتا ہے ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مثال (1):

| | |
|------------------------------|-------------------------------|
| چہ گویم کز انم چہ بر سر گذشت | بہ صنعا درم طفلی اندر گذشت |
| کہ ماہی گورش چو یونس نخورد | قضا نقش یوسف جمالے نکرد |
| کہ باد اجل بنیش از بن نکند | درین باغ سروے نیام بلند |
| کہ چندین گل اندام در خاک خفت | عجب نیست بر خاک اگر گل شکفت |
| کہ کودک رود پاک و آلودہ پیر | بدل کفتم اے ننگ مردان بمر |
| بر انداختم سگے از مرقدش | ز سودا و آشفگی بر قدش |
| بشورید حال و بگردید رنگ | ز ہولم دران جائے تاریک و تنگ |
| ز فرزندِ دلبندم آمد بگوش | چو باز آمدم زان تغیر بہوش |
| بیش باش و با روشنائی درائے | گرت وحشت آمد ز تاریک جائے |
| از بیجا چراغِ عمل بر فروز | ہب گور خواہی منور چو روز |
| مبادا کہ نخلش نیارد ز طرب | تن کارکن می بلرزد ز تب |
| کہ گندم نیفشاندہ خرمن برند | گروہے فراوان طمع ظن برند |
| کے بُرد خرمن کہ تخمے نشاند | بر آن خورد سعدی کہ بیخے نشاند |

(12) جب اُس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی

مباحث پیش نہیں کرتا جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد

دلاتا ہے جو اُس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گزرتی ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں۔ اور جب کسی امر پر اُس کو متنبہ کرنا منظور ہوتا ہے تو ایسے صاف اور صریح نتیجے سمجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سکھاتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے یہی سبب ہے کہ اُس کے بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھینچتے ہیں اور اُس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے۔

مثال (1):

| | |
|-----------------------------|-----------------------------|
| غبارش بیفشان و خارش بکن | پدر مردہ را سایہ بر سر فلکن |
| مدہ بوسہ بر روئے فرزند خویش | چو بنی تپتے سراغندہ پیش |
| وگر خشم گیرد کہ بارش برد | یتیم ار بگرید کہ نازش خرد |
| بلرزد ہے چون بگرید یتیم | آلا تا بگرید کہ عرش عظیم |
| بہ شفقت بیفشانش از چہرہ خاک | برحمت بکن آتش از دیدہ پاک |
| تو در سایہ خویشتم پرورش | اگر سایہ او برفت از سرش |
| کہ سر در کنار پدر داشتم | من انگہ سر تاجور داشتم |
| پریشان شدے خاطر چند کس | اگر بر وجودم نشستگی گس |
| نباشد کس از دوستانم نصیر | کنون گر بزندان برندم اسیر |
| کہ در طفلی از سر برقم پدر | مرا باشد از درد طفلان خبر |

مثال (2):

| | |
|------------------------------|------------------------------|
| ز نامحرمان گو فراتر نشین | پسر چون زدہ برگدشتش سنین |
| کہ تا چشم برہم زنی خانہ سوخت | بر پنبہ آتش نشاید فروخت |
| پسر را خردمندی آموز و رائے | چو خواہی کہ نامت بماند بجائے |
| بمیری و از تو نمائد کے | کہ گر عقل و رایش نباشد کے |
| پسر چون پدر نازکش پرورد | بسا روزگارا کہ سختی برد |
| گرش دوست داری بنازش مدار | خردمند و پرہیزگارش برار |

بہ نیک و بدش وعدہ و بیم کن
 ز توبخ و تہدید استاد بہ
 دگر دست داری چو قارون بہ گنج
 کہ باشد کہ نعت نماوند بدست
 مگردد تہی کیسہ پیشہ در
 بغربت بگرداندش در دیار
 کجا دست حاجت برد پیش کس
 نہ ہامون نوشت و نہ دریا شکافت
 خدا دادش اندر بزرگی صفا
 نہ بیند، جفا بیند از روزگار
 کہ چشمش نماوند بدست کسان
 دگر کس غمش خورد و آوارہ کرد
 کہ بدبخت و بے رہ کند چون خودش
 پدر گو ز خیرش فرو شوئے دست
 کہ پیش از پدر مرده بہ تا خلف

بہ نردی درش زجر و تعلیم کن
 نو آموز را ذکر تحسین و زہ
 بیاموز پروردہ را دست رنج
 مکن تکیہ بر دستگاہے کہ است
 پپایان رسد کیسہ بیم و زر
 چہ دانی کہ کردیدین روزگار
 چو بر پیشہ باشدش دسترس
 ندانی کہ سعدی مکان از چہ یافت
 بہ نردی بخورد از بزرگان قفا
 ہرآن طفل کو جور آموزگار
 پسر را نگو دار و راحت رسان
 ہرآن کس کہ فرزند را غم نخورد
 نگہدار از آمیزگار بدش
 پسر کو میان قلندر نشست
 در بخش مخور بر ہلاک و تلف

یہ خصوصیتیں جو گلستان اور بوستان میں ہم نے بتائی ہیں زیادہ غور کرنے سے اور بھی
 بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی ہیں جو ان کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث ہوئی ہیں مگر
 ہم انہیں پراقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

غزلیات شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو فی زمانہ فارسی اور اردو دیوانوں میں مروج ہے اس طریقے پر غالباً سب سے اول شیخ ہی کا دیوان مدون کیا گیا ہے کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوان غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعہ قصائد کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

علی بن احمد بے ستون جامع کلیات شیخ نے اول ہر غزل کے مطلع کا حرف لے کر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیے تھے۔ آخر اس ترتیب میں یہ قباحت نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ شیخ کی وفات کے بیالیس برس بعد اس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہو گئی۔

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا چار دیوان ہیں جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طہیات ہے۔ باقی تین دیوان اس سے چھوٹے ہیں اگرچہ ان میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سن کہولت اور پیری کے زمانے کے ہیں۔ مگر شیخ کا انداز بیان ابتدا ہی سے تغزل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبار صفائی اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ عنفوان شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سن کہولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے مگر شیخ کا کلام اس سے مستثنیٰ ہے۔ البتہ طہیات اور بدائع جو جوانی اور کہولت کے زمانے کے دیوان ہیں ان میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے۔

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نمکدان شعر لکھا ہے اگرچہ اس سے پہلے

انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصائد میں بھی مثل متاخرین کے اکثر تشبیہوں میں تغزل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے۔ مگر اُس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی۔ پہلے شاعری کا مدار زیادہ تر قصیدے اور مثنوی پر تھا۔ بعضے دوہتی (یعنی رباعی) اور قطعے کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے۔

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور با مزہ کر دیا کہ لوگ قصیدے اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گویوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیبر کہا ہے۔ مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بدون ذوق سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں۔ پس صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کا دیوان نمکدان شعرا ہے یا وہ غزل کا پیبر ہے انھیں کے لیے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا مذاق رکھتے ہیں اُن کے سوا اور لوگ جب تک کوئی صریح ماہہ الامتياز شیخ اور قدما کی غزل میں بیان نہ کیا جائے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزل کو کیا فوقیت ہے۔ لیکن وجدانیاں میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدما کی غزلیات میں ہے صاف صاف معلوم ہو۔ مجھ کو چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنہوں نے غزل کو نہایت با مزہ اور لطف انگیز اور مرغوب طابع خاص و عام کر دیا ہے۔

(1) شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تعنی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اُس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ تکلفت زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی بن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے 42 برس بعد اس کا کلام جمع کیا۔ اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی۔

نظر خدای پیمان ز سر ہوا نباشد سفر نیازمندان ز رہ خطا نباشد
 مجلس کے خاص و عام جا بجا بے ہوش اور از خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے
 برخاست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدتِ عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔
 میں کہتا ہوں کہ ایک بار میں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے شیخ کے
 ایک مطلع پر جو قوال نے بے مزا میر کے اُن کے سامنے گایا تھا دیکھا کہ اُن کا تمام بدن کا پینے لگا
 تھا اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور یہ کیفیت اُن پر بہت دیر تک طاری رہی تھی وہ مطلع
 یہ تھا۔

اے کہ آگاہ نہ عالم درویشان را تو چہ دانی کہ چہ سودا سرست ایشان را
 (2) شیخ کی غزل کو اُس جنابی عشق و محبت نے جو اُس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی
 زیادہ چکا دیا تھا۔ عرب اور عجم کے تمام شعرا جو عاشق مزاج ہوئے ہیں ان کی تشبیہ اور تغزل
 میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے۔ جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ شیخ ایک
 جگہ خود فرماتے ہیں ”آنکہ نشید ست ہرگز بوئے عشق۔ گو بشیر از آو خاک ماہوی“۔ یہی
 سبب ہے کہ وہ حسن و عشق، وصل و جدائی، یاس و امید، صبر و مجبوری، وعدہ و انتظار اور دیگر
 لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے اُن میں بالکل تصنع نہیں پایا جاتا اور وہ سب ایسی باتیں
 ہوتی ہیں جو اُس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں۔ اسی واسطے عشاق کے دل پر اُن کا زیادہ اثر
 ہوتا ہے ایسے اشعار سے شیخ کے چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مگر چند شعر بطور نمونے کے
 یہاں لکھے جاتے ہیں۔

| | |
|--|---|
| مقدار یار ہم نفس چون نداند بچکس | مانی کہ در خشک او فتد قیمت بدانند آب را |
| ایکہ گفتی ہیچ مشکل چون فراق یار نیست | گر امید وصل باشد آں چنان دشوار نیست |
| ہر کو بہمہ عمرش سوداے گلے بودہ ست | داند کہ چرا بلبل دیوانہ ہے باشد |
| دل و جانم بتو مشغول و نگہ بر چپ و راست | تا نداند رقیبان کہ تو منظور منی |
| دیگران چون بردند از نظر از دل بروند | تو چنان در دل من رفتہ کہ جان در بدنے |
| گفتہ بودم کہ رخت بر بندم | تا رہ بصرہ گیرم و بغداد |
| دست از دامنم نے دارد | خاک شیراز و آب زکنا باد |

ہزار جہد بکردم کہ سر عشق پوشم
 بہ زخم خورد حکایت کنم ز دست جراحت
 فحاش صبح دانی ز چہ روی دوست دارم
 برواے گدای مسکین دورے دگر طلب کن
 شربتے تلخ تر از درد فراق ت باید
 بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را
 برق میانی بخت باد بہاری بخاست
 نبود بر سر آتش میترم کہ بخوشم
 کہ تندرست ملامت کند چو من بخوشم
 کہ بروی دوست ماند کہ براغند نقابے
 کہ ترا بارہ گفتی و نیادت جوابے
 تا کند لذت وصل تو فراموش مرا
 از ذوق اندر نش پرواے در نباشد
 طاقت مجنون نما نہ خیمہ لیلی کجاست

(3) اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے اور وہاں جو حالت اُس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا جو کیفیت اُس کے دل پر گزری ہے اُس کو بیان کر رہا ہے۔ اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں اُسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے نہایت مزادیتے ہیں مثلاً۔

ای رو بہک چرا نہ نشستی بجای خویش
 ساربان آہستہ دان کارام جان در محمل است
 چہ رویت اینکہ پیش کاروان ست
 سلیمان ست گوئی در عماری
 ز روی کار من برقع بر انداخت
 شتر پیشی گرفت از من برفار
 بدار اے ساربان محمل زمانہ
 یار ہار افتادہ را در کاروان بگذاشتم
 ہر کرد خاک غربت پائے در گل ماند ماند
 پیوند روح میکند این باد مشک بیز
 شاہد بخوان و شمع بسوزان و گل بند
 خادمہ سراے را گو در حجرہ بند کن
 با شیر نیچہ کردی و دیدی سزائے خویش
 اشتران را بار بر پشت ست و مارا بردل ست
 مگر شمعے بدست ساربان ست
 کہ برباد صبا بخشش روان ست
 بیکہار آنکہ در برقع نہان ست
 کہ بر من پیش ازان بار گران ست
 کہ عہد وصل را آخر زمان ست
 بیوفا یاران کہ بر بستند بار خویش را
 گو در در خواب خوش بیند دیار خویش را
 ہنگام نوبت سحر ست ای ندیم خیز
 عنبر بسای و عود بسوزان و گل بریز
 تا بہ سر حضور مارہ نبرد موسوسے

(4) وہ اکثر حالات و واردات کو جو اُس کے دل پر گزرتے ہیں تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے۔ اس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا روم کے کلام میں بھی بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً۔

| | |
|-------------------------------|----------------------------------|
| بلخ شاکگان افتادہ بودم | نداستم کہ در سخن اند ماران |
| اے برادر ما بگرداب اندریم | وانکہ شصت میزند بر ساحل ست |
| رطب شیرین و دست از نخل کوتاہ | زلال اندر میان و تشنہ محروم |
| استاد کیمیا را بسیار زر بیاید | در خاک تیرہ کردن تا آنکہ زر پاشد |

(5) شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے جس سے قدما کی غزل معرا معلوم ہوتی ہے وہ ایک سیدھی سی بات کو بہر پھیر کر ایسے لطف اور خوشنما پیرایے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ سگر یزدوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گران بہا بنا دیتا ہے۔ مثلاً۔

| | |
|--|---|
| بود ہمیشہ پیش ازین رسم تو بیکند کُشی | از چہ مرانمی کشی من چہ گناہ کردہ ام |
| خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من | دین عجب کان دقت میگرم کہ کس بیدار نیست |
| من ندانستم از اول کہ تو بے مہر و وفائی | عہد تا بستن از ان بہ کہ بہ بندی و نپائی |
| دوستان عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی |
| گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم | چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی |
| من آن نیم کہ حلال از حرام نشناسم | شراب با تو حلال ست و آب بتو حرام |

اس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قدما کی غزل کو ہے اُس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قدما کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر دو شعر خاقانی اور انوری کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں۔

| | |
|------------------------------------|-------------------------|
| سہری | انوری |
| سرورامانی ولیکن سرورارفتار نیست | روی چون ماہ آسمان داری |
| ماہ رامانی ولیکن ماہ را گفتار نیست | قد چون سرور بوستان داری |

ایضاً
قادری بر ہرچہ میخوای بجز آزار من
زانکہ گر شمشیر بر فرقم زنی آزار نیست

ایضاً
ہمہ چشمیم تا برون آئی
ہمہ گویشیم تا چہ فرمائی

ایضاً
ہردم از شاخ زبانم میوہ تر میرسد
بوستانہا زستہ زان تخمیکہ در دل کاشتی

ایضاً
ہمہ با من جفا کند لیکن
بجفا ہیچ ازد نیازم

خاتانی
بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری
بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری

ایضاً
شاد باش از حسن خود کز وصف تو سحر حلال
طبع خاتانی بہ نظم آورد دیوان تازہ کرد

(6) سب سے بڑی بات جو شیخ اور نقذہ ما کی غزل میں ماہہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اُس کے دیوان کو نمکدان شعرا کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے تصوف اور درویشی، عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرایے میں ادا کرنا اور شاہد مطلق کے شیون اور صفات کو زلف و خال و خط و لب و دندان وغیرہ سے تعبیر کرنا۔ کالمین اور عرفا اور مشائخ پر رند، بادہ خوار میز و ش، پیر خرابات وغیرہ کے الفاظ اطلاق کرنے اور اُن کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا۔ سلوک اور فقیری کے مدارج مقامات یعنی صبر و رضا و تسلیم و توکل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔ محاسب و زاہد و فقیہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رو سے محل ادب ہیں طعن و تعریض کرنی اور غیر منتمرع اور آزاد لوگ جو از روئے مذہب قابل توہین و مذمت ہیں اُن کی خوبی ظاہر کرنی۔ دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانے۔ نامحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی۔ عقل و دانش کی جا بجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اُس کی تعریف کرنی۔ ساقی و مطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب و نغمے کا اس لیے طلبگار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے انقطاع میسر آئے۔ باد صبا اور نسیم سحری اور بولے گل کو اکثر مخاطب کرنا اور اُن کو قاصد و پیغامبر ٹھہرا کر اپنی آرزوئیں اور مرادیں اور حسرتیں اُن سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں

مثلاً عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایے میں بیان کرنی اور زلف و خال و خط سے شاہد مطلق کے شیون اور صفات مراد یعنی زیادہ دلکش اور موثر ہیں بہ نسبت اس کے کہ کھلی سورتھ گائی جائے۔ یعنی عشق حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنیٰ درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

اسی طرح داعظ، زاہد، شیخ، قاضی، صوفی، محتسب اور ایسے اشخاص کو جن کی مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے۔ ریا کاری اور کرا اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے تازنا اور رند او باش اور حُسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو اُن کی صاف باطنی۔ آزادی اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی بہ نسبت اس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور متشرع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزے دار ہے اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے۔

اگرچہ ان میں سے بعض عنوان جتہ جتہ قدما کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن شیخ کے ہاں اول تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اُس کے حسن بیان نے اُن کو بہت زیادہ اور لطف انگیز کر دیا ہے۔ شیخ کے بعد اول حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اس خصوصیت میں شیخ کا تتبع کیا ہے کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ملتان میں خان شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نو کر تھے اپنی زندگی ہی میں بھیج دیے تھے۔ اس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری میں ترقی کرنے کے لیے اُن کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ وہ اگرچہ اور اصناف سخن میں جیسا کہ مثنوی نہ سپہر¹ میں

1۔ نہ سپہر کے اشعار یہ ہیں۔

| | |
|--------------------------|-------------------------------|
| کس نہ بیند سہ نغمہ دلگیر | کہ مگرد بد لے منزل گیر |
| چون نمائند بہ دل خطے یاد | گرچہ شد زادہ همان دان کہ نژاد |
| تا بجائے کہ حد پارسیان | اندرین عہد دو تن گشت عیان |
| زان یکے سعدی و تانیس ہام | ہر دو را در غزل آئین تمام |
| لیک اگر سوے دگر بازے ہست | شعرشان ہست بدان گو نہ کہ ہست |

لکھتے ہیں اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے مگر شیخ کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خسرو سرت اندر ساغر معنی برینت شیرہ از خم خانہ مستی کہ در شیراز بود
 نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانہ کی غزلوں کا نام غزلیات قدیم اور جوانی اور
 کہولت کی غزلیات کا نام طہیات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے اسی
 طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیے ہیں۔
 تحفۃ الصغر۔ وسط الحیاة۔ غرة الکمال۔ بقیہ نقیہ ان قرینوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات
 سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ
 شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر انھیں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اول شیخ نے
 چکایا تھا مگر ان میں بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ انھیں کا حصہ ہو گئے
 ہیں۔ جیسے تصوف، شراب، اہل ظاہر پر خردہ گیری، دنیا کی بے ثباتی، عقل و تدبیر کی توہین،
 عشق و جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے ہیں جن میں
 مضامین مذکورہ بالا زیادہ تر باندھے گئے ہیں۔

| | |
|---|--|
| بر باد قلاشی دبیم این شرک تقوی نام را | بر خیز تا یکسو ہم این دلچ ارزق فام را |
| تا کو دکان در پے قہقہ این پیر درد آشام را | مے با جوانان خوردنم خاطر تمنا میکند |
| کز بوستان باد سحر خوش میدہد پیغام را | زین سنگتای خلوتم خاطر بہ صحرا مے کشد |
| باشد کہ نتواں یافتن دیگر چنین ایام را | غافل مہاش ارعاقلی در یاب گر صاحب دلی |
| مانیز در رقص آوریم آن سروسیم اندام را | جانیکہ سرو بوستان با پامے چو بین میرود |

☆☆☆

| | |
|--|--------------------------------------|
| ساقی بیار آن جام مے مطرب بسازان ساز را | وقت طرب خوش یا قہم آن دلبر طناز را |
| آہستہ تا نبود خبر زندان شہد باز را | اشب کہ بزم عارفان از شیخ رویت روہنست |
| بگر کہ لذت چون بود محبوب خوش آواز را | روی خوش و آواز خوش داند ہر یک لذتے |

☆☆☆

جان ندارد ہر کہ جانائش نیست
گر دلے داری بدلداریے سپار
تنگ عیش ست آنکہ بتائش نیست
ماجرای عقل پر سیدم ز عشق
ضالع آن کشور کہ سلطائش نیست
درد عشق از تندرستی خوشتر ست
گفت معزول ست و فرمانش نیست
گرچہ غیر از صبر درمائش نیست

☆☆☆

چنان بھوی تو آشفته ام بھوی مت
وگر بروی کسم دیدہ بر نئے باشد
کہ نیستم خبر از ہرچہ درد عالم ہست
غلام ہمت آنم کہ پائے بندیکیت
ظلیل من ہمہ بت ہائے آذری بشکت
نگاہ من بتو و دیگران بتو مشغول
بجائے متعلق شد از ہزار برست
معاشران ز مے و عارقان ز ساقی مت
برادران و عزیزان صمیم کلید
کہ اختیار من از دست رفت و تیر ازشت

☆☆☆

خوشتر از دوران عشق ایام نیست
مطربان رقص و صوفی در سماع
بامداد عاشقان را شام نیست
از ہزاران در یکے گیرد سماع
عشق را آغاز ہست انجام نیست
ہر کہے را نام معشوقی کہ ہست
زانکہ ہر کس محرم پیغام نیست
ی برد معشوقی مارا نام نیست
باد صبح و خاک شیراز آتشی ست
ہر کہ او دروے گرفت آرام نیست
سعدیا چون بت شکستی خود مباح
خود پرستی کتر از اصنام نیست

☆☆☆

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگت
برادران طریقت صمیم کلید
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگت
وگر بہ خفیہ نمی بایم شراب و سماع
کہ تو بہ دروہ عشق آگینہ و سنگت
چہ تربیت شنوم یا چہ مصنعت بنم
کہ نیک نامی در دہن عاشقان نکست
مرا کہ چشم بساقی و گوش بر چکست
بیا کہ ما سپر انداختیم گر چکست
گرفتہ ایم وچہ حاصل کہ بادور چکست
بیادگار کے دامن صیم صباح

بکش چنانکه تو دانی کہ بے مشاہدہ است فراختای جهان بر وجود ما تنگست
ملاست از دل سعدی فرو نشوید عشق سیاهی از جیشی چون رود کہ خود رنگست

☆☆☆

دوش بے روی تو آتش بسرم بر میشد آہم از دیدہ ہمیرفت وزمین تر میشد
تا بہ افسوس پایان زود عمر عزیز ہمہ شب ذکر تو میرفت و مکرر میشد
چشم مجنون چو بختت ہمہ لیلی دیدے مدعی بود گرش خواب میسر میشد
یارب آن صبح کجارفت کہ شہائے دگر نفسے میزد و آفاق منور میشد
سعدیا عقد شریا مگر امشب بکسخت ورنہ ہر شب ز گریبان سحر بر میشد

☆☆☆

مقلّب درون جلد ناز چه خبر دارد از شبان دراز
جہد کردم کہ دل بکس ندہم چه توان کرد با دو دیدہ باز
محتسب در قفای رندان ست غافل از صوفیان شاہد باز

☆☆☆

از تو با مصلحت خویش نمی پردازم ہچو پروانہ کہ مے سوزم و در پروازم
گر تو خواهی کہ بجوئی دلم امروز بجوی ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم
من خراباتی و دیوانہ ام و عاشق و بس بیشتر زین چه حکایت بکند غمازم
ماجرائے دل دیوانہ بگفتم بہ طیب کہ ہمہ شب در چشم ست بگلکرت بازم
گفت زین نوع شکایت کہ تو داری سعدی درد عشق ست و ندانم کہ چه درمان سازم

☆☆☆

برخیز تا طریق تکلف رہا کنیم دکان معرفت بدو جو نہ بہا کنیم
گر دیگر آن نگار قبا پوش بگردد ما نیز جامہای تصوف قبا کنیم

☆☆☆

ساقیائے دہ کہ مادردی کش میخانہ ایم با خرابات آشناؤ از خرد بیگانہ ایم
خویشمن سوزیم و جان بر سر نہادہ شمع وار ہر کجا در مجلس شمعے ست ما پروانہ ایم

اہل دانش را درین گفتار با ما کار نیست
عقلان را کے زیان دارد کہ ما دیوانہ ایم
خلق میگویند چاہ و فضل در فرزانگیست
گو مباش لبہا کہ ما زندان ما فرزانہ ایم
عیب تست از چشم گوہرین نداری ورنہ
ہر یک اندر بحر معنی گوہر یکدانہ ایم

☆☆☆

دو چشم مست میگویش بہر آرام ہشیاران
دو خواب آلودہ بر بودند عقل از دست بیداران
نصیحت گوی را از من بجوایے خوبہ دم درکش
کہ سیل از سرگذشت آنرا کہ میترسانی از باران
چہ بویست آنکہ عقل از من بہر دہبر و ہشیاری
ندانم باغ فردوس ست و یا بازار عطاران
تو با این مردم کوتہ نظر در چاہ کنغانی
بمصر ما پدید آیند یوسف را خریداران
اے کہ زدیدہ غائبی در دل ما نشستی
حسن تو جلوہ میکند دین ہمہ پردہ بستہ
خاطر عام بردہ خون خواص خوردہ
ما ہمہ صید کردہ خود ز کند جستہ

☆☆☆

می برزند ز مشرق شمع فلک زبانہ
اے ساقی صبحی در دہ سے شبانہ
عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش
ہوشم بہر زمانے تا کے غم زمانہ
صوفی چگونہ گردد گرد شراب صافی
کنجشک را نہ گنجہ عنقا در آشیانہ
آن کوزہ بر کفم نہ کاب حیات دارد
ہم طعم نار دارد ہم رنگ نار دانہ
گرمی بجان دہندت بستان کہ پیش دانا
ز آب حیات خوشتر خاک شرابخانہ
ہر روز بادی برد از بوستان گلے
مجروح میکند دل مسکین بلبلے
روییست ماہ پیکر و موسیست مشک بوی
ہر لالہ کہ میدہ از خاک و سہیلے
بالای خاک ہیچ عمارت نکرده اند
کزدے بدیر و زود نباشد تحولے
مکرده طلعتے ست جہان فریب ناک
دے بوستان دخرم صحراء لالہ زار
و امروز خارہائے مگیلان کشیدہ تیغ
دنیا پلے ست رہگذر دار آخرت
گوئی کہ خود نبود درین بوستان گلے
اہل تمیز خانہ تکمیرند بر پلے

☆☆☆

ایک آگاہ تہ عالم درویشان را
 حنج آزادی و حنج قناعت ملکی ست
 طلب منصب فانی نکند صاحب عقل
 جمع کردند و نهادند و محسرت رفتند
 در ازل بود کہ بیان محبت بستند
 عاشقے سوزنے بے سرو سامان دیدم
 نفسے سرد بر آورد و ضعیف از سرزد
 چند دلہند تو در گوش من آید بیہات
 سعیا عمر عزیزست بغفلت مگذار
 تو چہ دانی کہ چہ سودا بہ سرست ایشانرا
 کہ بشمشیر میسر نشود سلطان را
 عاقل آنست کہ اندیشہ کند پایان را
 وین چہ دارد کہ محسرت نگذارد آن را
 نکلند مرد اگرش سر برود بیان را
 گفتیم اے یار کن در سر فکر ت جان را
 گفت بگذار من بے سرو بے سامان را
 منکہ بر درد حریصم چہ کنم درمان را
 وقت فرصت نشود فوت مگر نادان را

☆☆☆

لا ابالی چہ کند دفتر دانائی را
 دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند
 ہمہ دانند کہ من سبزہ خط دارم دوست
 سعیا نوبتی امشب دہل صبح نکوفت
 طاقت و عظ نباشد سر سودائی را
 ورنہ بیند چہ بود فائدہ بیانی را
 نہ چو دیگر حیوان سبزہ صحرائی را
 یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

☆☆☆

شے و شمعے و گویندہ و زیبائے
 فرشتہ رشک برد بر جمال مجلس من
 ضرورتست بلا دیدن و جفا بردن
 قیامت ست کہ در روزگار ما برخاست
 دگر چہ بنی اگر رو ازو بگردانی
 وگر کنی نظر از دور کن کہ نزدیکست
 ندارم از ہمہ عالم جز این تمنائے
 گر التفات کند چون تو مجلس آرائے
 ز دست آنکہ ندارد بحسن ہمائے
 بہ راستی کہ بلا نیست آن نہ بالائے
 کہ نیست خوشتر از دور جہان تماشا ئے
 کہ سر بازی اگر پیشتر نمی پائے

☆☆☆

عالم کہ عارقان را گوید نظر بد و زند
 زیرا کہ بادشاہے چون بقعہ بگیرد
 گر یار ما بہ بیند صاحب نظر باشد
 بنیاد حکم اول زیر و زیر باشد

دیوانہ را کہ گوئی ہشیار باش و عاقل ترسم کہ از نصیحت دیوانہ تر باشد
ساقی بیار جاے مطرب گوی چیزی لب بردہان نے نہ تا عیشگر باشد

☆☆☆

ہوی زلف تو باہو عیش ہا دارم اگرچہ عیب کنندم کہ باد پیمانیت
ترا ملامتِ سعدی حلال کے باشد کہ برکناری و او درمیان دریانیت
الغرض شیخ سے پہلے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف تھا اور عشق مجازی کے
متعلق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عام عشق بازوں کی زبان
پر جاری ہوتی ہیں۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کم لکھی ہیں بلکہ وہ اکثر عشق و محبت کے
پوشیدہ اسرار و غوامض اور عمیق کیفیات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے جو دلہنگی کے زمانہ
میں ہر انسان پر گزرتے ہیں لیکن ہر شخص ان کو بیان نہیں کر سکتا بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر
کیا گزر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں اور بوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی
جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جاسکتی لیکن یہ بات
عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے کہ وصل کی امید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال
کی جاتی ہے جیسا کہ شیخ کہتا ہے۔

اے کہ گفتی چچ مشکل چون فراق یار نیست گر امید وصل باشد آہنجان دشوار نیست
یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند
نہیں ہوتے وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں اور اس
موقع کو یاد کر کے پچھتاتے ہیں جب کہ دلہنگی کے سامان انھوں نے خود مہتا کیے تھے اور بار
بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا ربط بڑھانے سے ایک مردہ چنگاری کو زیادہ افروختہ کیا تھا
لیکن ان کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اس جلن اور سوزش میں کس قدر لذت چھپی ہوئی ہے اور
یہ کہ اگر بالفرض ترک عشق و محبت پر ان کو اختیار دے دیا جائے تو وہ ہرگز اس دلہند قید سے
چھوٹا گوارا نہیں کر سکتے جیسا کہ شیخ نے کہا۔

بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را از ذوق اندر نش پرواے در نباشد
یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیر نہیں ہوتا اور جب

تک وہ سامنے رہتا ہے عاشق اُس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا مگر یہ بات بہت کم خیال میں گزرتی ہے کہ عشاق کو بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے جیسا کہ شیخ کہتا ہے۔

دل و جانم بتو مشغول و نگہ برچپ و راست تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی
یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے جب مدت کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو وہ شکوہ شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے مگر اس واقعی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اُس کے ملنے کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جدائی کے صدے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں چنانچہ شیخ نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

گفتہ بودم جو بیائی غم دل با تو گویم چہ گویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی
غرض کہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل معرا تھی۔ اول شیخ ہی نے ان مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذت اور نمک اور درد بھر دیا۔ جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اُس کے بعد اکثر محفلین نے وہی اصول اختیار کیے کیونکہ اُن کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندستان میں ایک آگ لگ گئی۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گو یوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص خوجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکہ جمایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا قرد و درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے یا راگ راگنی سے آشنا تھے یا شراب و کباب کا چکار رکھتے تھے یا عاشق مزاج اور ہمیش دوست تھے سب جاں و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں، حال و قال کی مجلسوں میں، قبوہ خانوں اور شراب خانوں میں، شعرا کی صحبتوں میں مشائخ کے حلقوں میں درود یوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی جس کے سبب سے قدرتی جذبات کا ایک طویل الذیل باب یعنی عشق و محبت کے

مضامین نہایت آب و رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے۔ مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اس بادۂ ہوش رُبا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق، خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے ثمرے مرتب نہ ہوئے شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاح شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اُس کی تاثیر جلد اور پایدار ہوتی ہے۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظ، امیر خسرو، میر حسن خجری، مولانا جامی وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔

اگرچہ ان بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف اور سلوک اور تصوف پر مبنی ہے۔ لیکن اُس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ جس طرح اُس سے ایک صوفی خدا پرست روحانی کیفیت اُٹھاتا ہے اسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اُس کے سننے اور پڑھنے سے براہینتہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے مال و دولت، علم و ہنر، نماز روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ غرض کہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر، مال اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے۔ اور آوارگی، رسوائی، بدنامی، بدستی بے سرو سامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا، توکل و قناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا۔ دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجاب اکبر جاننا۔ حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا۔ کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا۔ جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً رنگاں کھودینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اُس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکروں اور نوجوانوں کو بالطبع

مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے اُن کو لے اُڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جس کا شعر شریعت کا لُب لہاب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی دلنشین زیادہ ہوتے ہیں۔ پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اُس کے مقبوعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو۔ اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو اکثر اُن صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اس مجموعہ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے۔ عشق بازی، خُسن پرستی اُن کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولت مند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اس کا چسکا رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمر لوگ بھی اُس کا دم بھرتے ہیں۔ فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا۔ توکل اور قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنی۔ غیر قوموں کی ترقی کا ذکر نہ کر دینا و مافیہا کو بیچ و پوچ بتانا۔ عقل انسانی کو حقائق اشیا کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اس حالت کی ترقی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے۔

سٹیون صاحب نے جو کلکتہ رو پومورخہ جون 1756ء میں خولجہ حافظ کا حال لکھا ہے اُس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے جس کا نقل کرنا اس مقام پر شاید بے موقع نہ ہو گا وہ لکھتے ہیں کہ سعدی جو کہ حافظ کا چچا ہے ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا۔ اتفاقاً اسی وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اُٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا۔ حافظ نے اُس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ کر وہاں چھوڑ دی۔ اور آپ چل دیا۔ شیخ نے پھر وہاں آ کر حافظ کو نہ پایا

مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی۔ سعدی اس بات سے ناخوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے؟ اُس نے کہا ہاں! شیخ نے اُس سے ساری غزل پوری کرائی اور جب وہ غزل سنی تو اُس کو بددعا دی کہ ”جو شخص تیری غزل پڑھے گا وہ عقل سے بیگانہ رہے گا“ اس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعہ مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بیشک سعدی کی بددعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی۔ کیونکہ اُس کے ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے۔“ میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا آگامیچھا ہے قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاولت سے بیشک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور ادب اش والواط کو بے فکری، ناعاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر ہی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔ ہر زمانہ کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دولت مند اور ذی اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حب جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں اُس وقت البتہ یہ امید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبات سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہو گئی ہو اور اولوالعزمی کا حزم اُن کی طبیعت میں جل گیا ہو۔ اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں اُس وقت دنیا سے اُن کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکل کا اُن کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے لمعاتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اُس کو گل کر دینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اُس کے قسبیین کی غزل نے اُس زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشہ جاہ دنیوی عروج پر تھا کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہوں لیکن اس زمانہ میں میرے نزدیک اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اس سے اُن کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ کہے لوگ اُس سے متاثر ہوں نہ یہ کہ اُس سے کبھی مضرت ناسخ پیدا نہ ہونے پائیں۔ باروت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں باایں ہمہ ان کے موجودوں کی دانشمندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی۔

قصائد وغیرہ

اس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قصیدے، مرعے، ترجیع بند طبع اور مثلث جمع کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی۔ یا تو اس کی طبیعت ہی کو قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گون نہ تھی۔ اور یا اس نے مدح و ستائش کے طریقہ مروجہ کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا مگر چونکہ اس زمانے کے دستور کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا کچھ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا اس لیے اس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گو یوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں۔

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مدحی کی مسلمانوں میں تھی اس کی تفصیل کرنے کا یہاں محل نہیں مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عباسی خلیفہ بغداد کے زمانے سے شعرا کو نہایت گراں بہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شاعروں کو مل جاتے تھے خلفا اور امرا کو اپنی تعریفیں سننے کا ایسا شوق ہو گیا تھا کہ ان کا مدح کسی اور شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو ان کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر تشبیب میں زیادہ شعر لکھ لانا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال و خط کی تعریف میں خرچ کر دیتے ہیں صرف کچھ بچے کچھ خیالات ہمارے سہارے ہیں۔ ہزاروں علما و فضلا نے قصیدہ گوئی اور مدحی کو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا تھا اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی کرے۔ شعر اتمام ممالک اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے۔

عباسیوں کے علاوہ فاطمی، دیلمی، کردی، طاہری، صفاری، سامانی، غزنوی، سلجوقی، خوارزم شاهی وغیرہ تمام سلسلوں میں مداحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی۔ ایران میں بھی

سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد ہی کا زور و شور رہا مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ تر فارسی زبان پر آٹھیرا۔ فارسی قصیدے نے بھی خوب رواج پایا۔ ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں حنّی، ابوتمام، بھتری اور ذوالرمتہ نے حاصل کی تھی۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امراے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور تہواروں میں نذر دکھانا مگر قصیدے کی حالت اُس وقت ایسی بُری تھی کہ شیخ کو اپنی جنّی استقامت اور سنجیدگی کے سبب اُس روش پر چلنا دشوار تھا۔ مدوح کی ستائش میں سراسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کیے جاتے تھے۔ الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی تھی۔ مسائل علمیہ اور مقدمات حکمیہ اور سلوک و تصوف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی اصطلاحیں اظہار علم و فضل کے لیے اُن میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں۔ صنایع لفظی خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو اُن کا زیور سمجھتے تھے۔ شیخ کی آزادی اور حق گوئی خصوصاً سادہ بیانی جو اُس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی ان تکلفات لایعنی سے مانع تھی اُس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغہ اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیرِ پائے تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلان دہد
 شیخ بوستان میں جہاں اتا بک ابو بکر سعدی کی تعریف لکھتا ہے وہاں ظہیر کے اس شعر پر
 اس طرح تعریف کرنا ہے۔

| | |
|---------------------------|---------------------------|
| براہ تکلف مرو سعدیا | اگر صدق داری بیار و بیا |
| تو منزل شناسی و شہ راہ رو | تو حق گو و خسرو حقائق شنو |
| چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان | نہی زیرِ پائے قزل ارسلان |
| مگو پائے عزت بر افلاک نہ | بگوروئے اخلاص بر خاک نہ |

اس کے سوا اور اکثر جگہ اُس نے مذاح پیشگی سے نفرت اور اعراض ظاہر کیا ہے۔ اُس کے ایک قطعہ کا یہ مضمون ہے کہ ”لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو کیوں سختیاں اٹھاتا

ہے اور کیوں اپنے کمال شاعری سے متمتع نہیں ہوتا؟ اگر تو مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازے پر اپنا مطلب در یوزہ گروں کی طرح لے جاؤں۔ اگر ایک جو بھر ہنر کے عوض میں کوئی مجھ کو سوخزانی بخش دے تو وہ مستحق شکر ہے اور میں قابلِ نفریں۔“

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغہ اور خوشامد سے نفرت تھی کوئی ضرورت بھی ایسی داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور قصیدہ گوئی کا جو اُس وقت کمال سمجھا جاتا تھا اُس کے حاصل کرنے میں مقتضائے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفر رہتا تھا اور اپنے دوستوں کو اس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اُس کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ قصیدہ کو مقبول خاص و عام بنائے اور اس ذریعہ سے دربار میں تقرب حاصل کرے جتنے نامی قصیدہ گو ایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ خوشی کی تقریبوں میں طوفان کے تودے بنا کر لائیں اور اُن میں جس قدر زیادہ مبالغہ اور جھوٹ کو کام فرمائیں اُسی قدر گراں بہا صلے اور انعام پائیں۔ چنانچہ ظہیر قزل ارسلان کے ہاں، انوری سلطان سنجری کے ہاں، رشید و طوطا خوارزم شاہ اُتمز کے ہاں اور خاقانی شردان شاہ کے ہاں ملک الشعراء تھے۔ ان لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوتی تھی اور اُن کی ترقی اور تقرب کا مدار صرف اُن باتوں پر تھا جو اُس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں یہی سبب ہے کہ قصیدہ کے سوا کوئی بڑی یادگار انھوں نے نہیں چھوڑی۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانے کے دستور کے موافق کچھ نہ کچھ قصیدہ کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ لیکن اُس کو دیے جھوٹے اور نمائشی طلسم باندھنے کچھ ضرور نہ تھے جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں۔ اسی لیے غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ میں ہرگز اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کو معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی بلکہ میرے نزدیک جس طرح رولرٹیز حاخط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اُسی طرح طبیعت کی استقامت کبھی بے راہ نہیں چلنے دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ حد شاعری سے متجاوز ہو گیا ہے ایسی اور کوئی صنعت نہیں ہوئی۔ مذہبی قصائد

سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات کو سن کر خاص دعاء کے دل میں اُس کی محبت اور اُس کے ساتھ حُسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ اگر وہ صفتیں اُس میں موجود ہوں تو اُن میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم اُن کو اسی حال پر قائم رکھے اور اگر نہ ہوں تو اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرے یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات کہ مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا اُن کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اُس مدح کی وقعت ایک جھوٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلان کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ ”تصور جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے تب جا کر قزل ارسلان کی رکاب پر بوسا دیتا ہے۔ اس سے قزل ارسلان کے دل پر سوا اس کے کہ اُس کو ایک جھوٹ سمجھا ہو اور کیا اثر ہوا ہوگا۔ یا مثلاً انوری جو محمد الدین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ ”اگر وہ زمانہ گزشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانہ آئندہ کی جگہ آجائے“ اس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اس کے کہ مدح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خا کا اُزاتا ہے اور کیا خیال گزرا ہوگا۔ یہی حال اُن تمام قصیدہ گوئیوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے۔ شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فرط کراہت کے سبب مدح و ستائش کے اس ناپسندیدہ طریقہ کو اختیار نہیں کیا۔ اُس نے قصائد بھی اسی اپنی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بے تکلفی کے ساتھ جو کہ اُس کے کلام کی عام خاصیت ہے لکھے ہیں۔ اُس کے قصائد سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے۔ اُس نے اکثر قصیدے اور ترجیع بند وغیرہ محض محبت اور خلوص اور دلی جوش سے لکھے ہیں۔ نہ خوشامد کی راہ سے اور نہ صلہ و انعام کی اُمید پر۔ باقی جس قدر قصیدے بضرورت سلاطین عہد اور حکام وقت کی شان میں لکھے ہیں اُن کے اسلوب بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے اہل دنیا کی سنجیدگی اور فصاحت و پند کے لیے قصیدہ کو اُن سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض قصیدوں میں پند و اندرز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو اُس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نامزد کیے ہیں۔ ان کے سوا اور قصیدوں میں اول مدح و ستائش کی چاٹ دے کر پھر فصاحت کرنی شروع کی ہے۔

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اس کی علت غائی جو اس نے قرار دی تھی ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اس کی رعایا میں سے تھا اس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے۔

بنوبت اند ملوک اندرین سبج سرائے
چہ مایہ بر سر این ملک سردران بودند
نیاز باید و طاعت نہ شوکت و ناموس
بہ تیغ و نیزہ گرھند جنگجویان ملک
چو ہمت است چہ حاجت بہ گرز مغرکوب
عمل بیار کہ زحمت سرائے آخرت است
ہر آنکست کہ بہ آزار خلق فرماید
بکلمہ دل دشمن نشیند آن مغرور
دیار مشرق و مغرب بگیر و جنگ بجوے
نگویمت چو زبان آوران رنگ آمیز
نکابد انچه نوشتہ است عمر و نغزاید
دوسرے قصیدہ میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اتابک ابوبکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے۔

مدح شیوہ درویش نیست تا گویم
نگویمت کہ بفضل از کرام متازی
وگرچہ این ہمہ ہستی نصیحت اولی تر
بسعی کوش کہ تاگہ فراخت نبود
خدائے یوسف صدیق را عزیز نہ کرد
شکوہ لشکر و جاہ و جلال و مالت ہست
بقائے مملکت اندر وجود یک حرفست
کہ ہجو بحر مہیطی و ابر آذاری
نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری
کہ پند راہ خلاص است و دوستی یاری
کہ سر بخاری، اگر روے شیر زخاری
بخو بروی - و لیکن بنجوب کرداری
دلے بکار نیاید بجز نگو کاری
کہ دست پہنچ قوی بر ضعیف نگماری

پس از گرفتن عالم چو کوچ خواهد بود روستا گر ہمہ عالم گرفتہ انگاری
 بہ نیک و بد چو بباہد گزشت آن بہتر کہ نیک نام بدست آوری و بگوری
 ہزار سال گویم بقائے عمر تو باد کہ این مبالغہ دانم ز عقل نشماری
 ہمین سعادت و توفیق بر مزیت باد کہ حق گزاری و ناحق کے نیازاری

اتابک سلجوق شاہ بن سلفر شاہ جو اتابکوں کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ گزرا ہے
 اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا اس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے۔

مراد سعدی از انشاد و زحمت خدمت نصیحت است بسمع قبول شاہشاہ
 دوام دولت و آرام مملکت خواہی ثبات راحت و امن مزید و رفعت و جاہ
 کمر بطاعت و انصاف و عدل و عنو بہ بند چو دست رحمت حق بر سر ت نہادہ کلاہ
 تو روشن آئینہ ز آہ دردمند بہ ترس عزیز من! کہ اثر میکند در آئینہ آہ
 معلمان بد آموز را سخن مشو کہ دیر سال بمانی بکام نیکی خواہ

ایل خان یعنی ہلاکو خان یا اس کے بیٹے ابا قاخان کی شان میں جن کی ہیبت سے روم و
 روس و چین کے بادشاہ لرزتے تھے مدحیہ اشعار کہہ کر لکھتا ہے۔

ہر نو بچہ نظر بہ یکے سے کند سپہر ہر مدتے زمین بہ یکے میدہد امان
 بیچے نشان کہ دولت باقیست بر دہد کاین باغ عمر گاہ بہارست و گہ خزان
 اے بادشاہ روئے زمین دور از آن تست اندیشہٴ قلب دوران کن و زمان
 چون کام جاودان مصور نے شود حرم کسیکہ زندہ کند نام جاودان
 نادان کہ بخل سے کند و گنج سے نہد مزدور دشمن ست تو بر دوستان فشان
 یارب تو ہر چہ راے صوابست و فعل خیر اندر دل وے آگن و بردست وے بر آن
 آہوئے طبع بندہ چنین مشک میدہد کز پارس میزند بہ تاتار ش ارمنان

سردار اٹلیانو جو خاندان اتابک کے زوال کے بعد سلطان ابا قاخان پر ہلاکو خان
 کے حکم سے فارس کا فرمان روا مقرر ہوا تھا اور اپنے قدیم تاتاری مذہب پر نہایت چٹنگی سے

ثابت قدم تھا اُس کے شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں اُن میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج ہے از انجملہ ایک قصیدہ میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھا ہے۔

حرامش باد ملک و بادشاہی کہ پیشش مدح گویند از قفا دم
 عروس زشت زیبا کے توان کرد . وگر بر خود کند دیبائے مُظلم
 اگر مردم ہمین بالا و ریش اند بہ نیزہ نیز بر بستہ ست پرچم
 چنین پند از پدر نشیدہ باشی الا گر ہوشیاری بشنو از عم
 چو یزدانت مکرم کرد مخصوص چنان زی در میان خلق عالم
 کہ گر وقتے میان بادشاہست نباشد ہیچنان باشی مکرم
 نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ سخن ملکہ ست سعدی را مسلم
 مقامات از دو بیرون نیست فردا بہشت جاودانی یا جہنم

سلجوق شاہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اُس کی مدح کو ایک اور قصیدہ میں اس طرح ختم کیا

ہے۔

جہان نماند و آثار مملکت ماند بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم
 کہ ملک و دولت ضحاک بیکند آزار نماند و تا بہ قیامت برو بماند رقم
 خطاے بندہ گیری کہ مہتران و ملوک شنیدہ اند نصیحت ز کہتران خدم
 خنک کسیکہ پس ازوے حدیث خیر کنند کہ جز حدیث نمی ماند از بنی آدم

ان کے سواے جو قصیدے خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کے بھائی

خواجہ علاء الدین جوینی اور محمد الدین روئی اور فخر الدین ابوبکر وغیرہم کی شان میں ہیں۔ اُن میں مدح اکثر برائے نام ہے زیادہ تر نصیحت و پند ہے اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں اُن میں صرف نصائح و مواعظ یا فصل بہار کا سماں یا معشوق کی تعریف یا حمد الہی وغیرہ مندرج ہے۔

ایک مختصر قصیدہ اول سے آخر تک بھی اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مدح

اور نصیحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو۔

مدح و موعظه محمد الدین رومی

جهان بر آب نهادست زندگی بر باد
جهان نماند و خرم روان آدے
سرائے دولت باقی نعیم آخرت ست
کدام عیش درین بوستان که باد اجل
حیات عاریتے خانه ایست در ره سیل
بے برآید و بے ما فرو شود خورشید
هر آنچه میگذرد دل منه که دجله بے
گرت نہ دست برآید چون فل باش کریم
بے بدیدہ حسرت ز پس نگاه کند
وجود خلق بدل میکند ورنہ زمین
چو طفل بر ہمہ بازید و بر ہمہ خندید
عروس ملک کوروی دختریت ولے
نہ خود سریر سلیمان بہاد رفتے و پس
ہمین نصیحت من گوشدار و نیکی کن
نداشت چشم بصیرت کہ گرد کرد و نخورد
چنان کہ صاحب فرخندہ راے محمد الدین
گنومت بہ تکلف فلان بدولت و دین
تو آن برادر صاحب دلی کہ مادر دہر
بہ روزگار تو ایام دست فتنہ بہ بست

غلام ہمت آنم کہ دل برو نہ نهاد
کہ باز ماند ازو در جهان بہ نیکی یاد
زمین سخت نگہ کن چو می نمی بنیاد
ہے برآورد از بیخ قامت شمشاد
چراغ عمر نہادہ است بر در سچہ باد
بہارگاہ خزان باشد و گہے مراد
پس از خلیفہ بخواد گذشت در بغداد
ورت بدست نباشد چو سرد باش آزاد
کیکہ برگ قیامت ز پیش نفرستاد
ہمان ولایت کجست و ست ملک قباد
عجب تر آنکہ نہ کشند دیگران استاد
وفا نئے کند این ست مہر بادا باد
کہ ہر کجا کہ سریریت می رود بر باد
کہ دانم از پس مرگ کئی بہ نیکی یاد
بہر دو گوی سعادت کہ صرف کرد و بداد
کہ بیخ اجر نشاند و بنائے خیر نہاد
سہم محمد و معالی جهان دانش و داد
بہ سالہا چو فرزند نیکنیت نہ زاد
بہ یمن تو در اقبال بر جهان بکشاد

دلیل آنکہ ترا از خدائے نیک آید بس ست خلق جهان را کہ از تو نیک افتاد
یکے دعا گمت بے رعونت از سر صدق خدات در نفس آخرین پیامر زاد
تو ہم زیان نہ کنی گر بصدق دل گوئی کہ آفرین خدا بر روان سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد بن ابوبکر کے مرثیہ میں لکھے ہیں اور جو کلیات میں غلطی سے امیر فخر الدین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے بطور نمونہ کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

غریبان را دل از بہر تو خون ست دل خویشان نمی دانم کہ چون ست
عنان گریہ چون شاید گرفتن کہ از دست شکیبائی برون ست
مگر شہنشاہ اندر قلب لشکر نمی آید کہ رایت سرگون ست
شکیبائی مجو از جان مہجور کہ بار از طاقت مسکین فزون ست
سکون در آتش سوزندہ گفتم نشاید کرد ، درمان ہم سکون ست
کہ دنیا صافے بد عہد و خونخوار زمانہ مادرے بے مہر و دون ست
نہ اکنون ست بر ما جور لیام کہ از دوران آدم تا کنون ست

نمی دانم حدیث نامہ چون است

ہی ہنم کہ عنوانش بخون ست

بزرگان چشم و دل در انتظار اند عزیزان وقت و ساعت می شمارند

1۔ امیر فخر الدین ابوبکر اتا بک ابوبکر کے امراء نامہ میں سے تھا جو اتنی درجے سے مصعب امارت بلکہ مشارک ملک تک پہنچا تھا اور سعد ابوبکر اتا بک کا بیٹا تھا جس زمانہ میں ہلاکو خان نے بغداد کو فتح کیا تھا ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد ابوبکر کو اظہار دوستی و خیر خواہی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا جب وہاں سے باغراز قمام رخصت ہوا تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سنی جس سے اور ولی عہدوں کی طرح اس کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر اس کو اس خبر سے ایسا صدمہ ہوا کہ وہ ہی میں سخت بیمار ہو گیا اور سترے ہی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا۔ اس کی سوتلی جب شیراز میں آئی تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ہے جیسا کہ ترجیع کے شعر سے ظاہر ہے۔ سعد کے بعد اس کا بیٹا اتا بک محمد مظفر اس کا جانشین ہوا۔

غلامان دُر و گوہر می فشاندند
ملک خان و مساق و بدر و ترخان
که شاہنشاہ عادل سعد بوبکر
حرم شادی کنان بر طاق و ایوان
زمین می گفت عیثے خوش گزاریم
امید تاج و تختِ خسروی بود
چہ شد پاکیزہ رویان حرم را
نشاید پارہ کردن زیور دروے
و لیکن باچنین داغ جگر سوز
دلے شاید کہ مجبوران بگریند

نمی دانم حدیث نامہ چون ست

ہی پنم کہ عنوانش بخون ست

پس از مرگ جوانان گل مماناد
کس اندر زندگانی قیمت دوست
سر آمد روزگار سعد بوبکر
بہ تلخی رفت از دنیاے شیرین
جزائے مردہ رفتن در غریبی
درین گیتی مظفر شاہ عادل
سعادت پر تو نیکان دہادش
روان سعد را با جان بوبکر
بکام دوستان و بخت و فیروز

نمی دانم حدیث نامہ چون ست

ہی پنم کہ عنوانش بخون ست

کنیران دست و ساعد می نگارند
برہواران تازی بر سوارند
بہ ایوان شہنشاہی درآرند
کہ مروارید بر تاجش بہارند
ازان پس آسمان گفت آز گزارند
ازین غافل کہ تابوش درآرند
کہ بر سر گاہ بر زیور غبارند
کہ مردم تحت امر کردگارند
نمی شاید کہ فریادے ندارند
روا باشد کہ مظلومان بزارند

پس از گل در چمن بلبل مخواناد
ندانہ، کس چنین قیمت بداناد
خداوندش برحمت در رساناد
زلال کام در حلقش چکاناد
شراب از دست پیغمبر ستاناد
محمد نام بردارش بماناد
بخوے صالحانش پروراناد
بہ اوج روح و راحت گستراناد
بے دوران دیگر بگوراناد

صاحبیہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرق اشعار کا سو صفحہ کے قریب ہے جس میں قطعہ، رباعی، فرد، طبع، مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدین حسین صاحب دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اس لیے شیخ نے اس مجموعہ کا نام صاحبیہ رکھا۔

ان اشعار میں کوئی نئی خصوصیت نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے بیشتر اشعار فصاحت و پند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند قطعے اور رباعیاں جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں نقل کی جاتی ہیں۔

قطعات

تفسیر کسان

ناکسان را فراتے ست عظیم گر چہ تاریک طبع و بد خویند
چون دو کس مشورت کنند بہم گوید این عیب من ہی گویند

☆☆☆

خصائل گان

مگے شکایتِ ایام با یکے میگفت نہ پنم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم
نہ آشیانہ چو مرغان نہ غلہ چون موران قائم صفت و بردباری آیینم
گرم دہند خورم ورنہ میروم آزاد نہ ہم چو آدمیان دشمناک بنشینم
مرانہ برگ زمستان نہ عیش تابستان کفایت ست ہمین پوئین پارینم
نہ در ریاضت و خلوت مقام میازم کہ جایگاہ کلوخ ست و سنگ بالینم
بہ لقمہ کہ تناول کنم ز دست کے رواست گر بزند بعد ازان بہ ڈوپینم

چو گر بہ در نہ رہا ہم زدست مردم چیز دور اوفادہ بود ریزہ ریزہ بر چہنم
 بجائے من کہ نشید کہ در مقام رضا برابر ست گلستان و قل سر گینم
 مرا کہ سیرت ازین جنس و خوبدین صفت ست چه کردہ ام کہ سزاوار سنگ و نقرینم
 جواب داد کزین بیش نعت خویش گو کہ خیرہ گشت زو صفت زبان تحسینم
 ہمین دو خصلت ملعون کفایت کہ ترا غریب دشمن و مُردار خوار سے بنم

☆☆☆

راحت بعد از مشقت

نظر کردم بہ چشمِ راء و تدبیر ندیدم بہ زخاموشیِ خصالے
 گویم لب بہ بند و دیدہ بردوز و لیکن ہر مقامے را مقالے
 زمانے بحث علم و درس و تنزیل کہ باشد نفس انسان را کمالے
 زمانے شعر و شطرنج و حکایت کہ خاطر را بود دفع ملالے
 خدایت آنکہ ذات بے مثالش نگرود ہرگز از حالے بحالے

☆☆☆

بہرودی بنی نوع

رحم اللہ معشر الماضین کہ بہرودی قدم سپردندے
 راحت نفس بندگانِ خداے راحت جان خود شمرندے
 آن عزیزان چو زندہ می نشوند کاش این نا کسان بہرودندے

☆☆☆

انجامِ خالمان

بس دست دعا بر آسمان بود تا پائے برآمدت بہ مجے
 اے گرگ نہ گفتمت کہ روزے تا کہ بہ سر افتد پلنگے

☆☆☆

حقوقِ پدران

اے طفل کہ دفعِ گم از خود نتوانی ہر چند کہ بالغ شدی آخر نہ ہمائی

شکرانہ زور آوری روز جوانی آنت کہ قدر پدہ پیر بدانی

☆☆☆

شانِ رزاقی

صانع نقش بند بے مانند کہ ہمہ نقش او نگو آید
رزق طائر نہاد در پر و بال کہ بہر طعمہ فرد آید
روزی عنکبوت را بہ گس پر دہد تا بہ نزد او آید

☆☆☆

ولی خائن

الحق امنائے مال ایام همچون تو حلال زادہ یابند
ہرگز زن و مرد کفر و اسلام نفس از تو پلید تر نہ زابند
ظفان ترا پدر بمراد تا جور وصی بیازمایند
اطفال عزیز ناز پرورد از دست تو دست بر خدایند

☆☆☆

عالم محتاط در حق خود

امیر ماعسک از دست خلق می خورد کہ زہر در قدرح آنگیں تواند بود
عجب کہ در غسل از زہر میکند پرہیز حذر نمیکنند از تیر آہ زہر آلود

☆☆☆

رحم بر بیگانگان

شنیدم کہ بیوہ زنی درومند ہے گفت و رخ بر زمین می نہاد
ہر آن کہ خدا را کہ بر بیوہ زن رحم نباشد زنش بیوہ باد

☆☆☆

منع دشنام

ہر بد کہ بخود نمی پسندی باکس کن اے برادر من
گر مادر خویش دوست داری دشنام مده بہ مادر من

مدافعت دشمن

مقابلت نکلند با حجر بہ پیشانی
مگر کسے کہ ہموں کند بتادانی
کس این خطانہ پسندد کہ دفع دشمن خود
توانی و کفنی یا کفنی و نتوانی

☆☆☆

مطابقہ

شنیدہ ام کہ فقہی بہ دشتبانے گفت
ازین طرف دو بہ دانگے، گر اختیار کنی
سوال کرد کہ چندین تفاوت از پے چوست
بکفیت از انچه تو بنی حلال و ملک من است
وزان دگر پسرانم بخارت آوردند
فقیہ گفت۔ حکایت دراز خواهی کرد
کہ بیج خربزه داری رمیدہ و گفت آری
وزن آن، چہار بہ دانگے قیاس کن بارے
کہ فرق نیست میان دو نوع بسیارے
نیامدہ ست بدستم بوجہ آزارے
حرام را نبود نزد شرع مقدارے
ازین حرامترت ہست صد بہ دینارے

☆☆☆

احسان دوستی

تا سگان را وجوہ پیدا نیست
قمرے در میان شان انداز
مشفق و مہربان یک دگر اند
کہ تہی گاہ یکدگر بدرند

☆☆☆

رباعیات

پاس ہمد

شب نیست کہ چشم آرزو مند تو نیست وین جان بلب رسیدہ در بند تو نیست
گر تو دگرے بجائے من بگویی من عہد تو نکلنم کہ مانند تو نیست

☆☆☆

تاسف بر عمر گزشتہ

ماہ امید عمر از شت برفت بے فائدہ روزم چو شب سست برفت
عمرے کہ ازو دے بجائے ارزد افسوس کہ رائگانم از دست برفت

☆☆☆

انجام نظام

از بس کہ بیازرد دل دشمن و دوست گوئی بکناہ مسخ کردندش پوست
وقعہ غم او بر دلہا بودے اکنون ہمہ غم ہائے جہان بردل اوست

☆☆☆

فصل دوست بر ہمسج

گویند ہوائے فصل آواز خوش است بوے گل و بانگ مرغ گلزار خوش است
ابریشم زیر و نملہ زار خوش است اے بے خبران این ہمہ بایار خوش است

☆☆☆

مجموعی عاشق

گویند مرد در پئے آن سرو بلند انگشت نماے خلق بودن تا چند
بے فائدہ پنہام وہ اے دانشمند من چون نروم کہ سے برندم بہ کند

خولبرگ

آہو برہ را کہ شیر درپے باشد بچارہ چہ اعتماد بروے باشد
این ملخ در آب چند تواند بود دین برف در آفتاب تا کے باشد

☆☆☆

توحید

آزرا کہ نظر بروئے ہر کس باشد در دیدہ صاحب نظران خس باشد
قاضی بہ دو شاہد بدہ فتویٰ شرع در مذہب عشق شاہدے بس باشد

☆☆☆

ریاضت کشان

مردان ہمہ عمر پارہ بر دوختہ اند قوتے بہزار حیلہ اندوختہ اند
فرداے قیامت بکناہ ایشان را باشد نہ سوزند کہ خود سوختہ اند

☆☆☆

مطابق

با دوست بگرمایہ درم خلوت بود وان روے گلنیش گل حمام آلود
گفتا دگر این روے کے دارد دوست گفتتم بگل آفتاب نتوان اندود

☆☆☆

فروہ حسن

چون صورت خویشتم در آئینہ بدید وان کام و دہان و لب و دندان بگوید
میگفت چنانکہ معوانست شنید بس جان بلب آمد کہ بدین لب زسید

☆☆☆

انتظار

امشب نہ بیاض روز بر می آید نہ نالہ مرغان سحر می آید
بیدار نشسته ام نظر بر سر کوه تا صبح کہ از سنگ بدر می آید

☆☆☆

فصل نوزان

وقت ست کہ چشم فتنہ خوابش بہرہ باد از رخ گل حسن شبابش بہرہ
گل وقت رسیدن آب عطار بہرہ عطار بوقت رفتن آتش بہرہ

☆☆☆

فصل بہار

وقت گل و روز شادمانی آمد ہنگام نشاط و کارمانی آمد
آن شد کہ بر ما نتوانی آمد سرا شد و وقت مہربانی آمد

☆☆☆

حکمت عاشق و معشوق

ما چاکر آنیم کہ دل برہاید یا دل بہ کسے دہد کہ جان آساید
آنکس کہ نہ عاشق و نہ معشوق کس ست در ملک خدا اگر نباشد شاید

☆☆☆

بے ثباتی زعمانی

آن گل کہ ہنوز نو بدشت آمدہ بود نکلفتہ تمام، باد مہرش برہود
بیچارہ بے امید در خاطر داشت امید دراز و عمر کوتاہ چہ سود

☆☆☆

حسرت

من دوش قضا یار و قدر پشتم بود تاریخ ز نندان تو در مشتم بود
دیدم کہ ہی گزم لب شیرینت بیدار چہ عہتم سر انگشتم بود

☆☆☆

صلح با دشمن قوی

چون خیل تو صد باشد و خصم تو ہزار خود را بہ ہلاک ی سپاری ز نہار
تا بتوانی برآور از خصم دمار چون جنگ عدانی آشتی عیب مدار

☆☆☆

ناگریز بودن معشوق

نامردم اگر زخم سر از مهر تو باز خواهی باشم بجور و خواهی بنواز
در بگریزم ز دست اے مایه ناز هر جا که روم پیش تو می آیم باز

☆☆☆

صدق طلب

تا سر نه کنم در سرت اے مایه ناز کوزه نه کنم نه دامنت دست نیاز
هر چند که راهم بتو دورست و دراز در راه بمرم و همگرم ز تو باز

☆☆☆

خوب رویان را دوست داشتن

گر بے خبران و عیب گویان از پس منسوب کندم بهواؤ بهوس
آخر نه گناه است که من کردم و بس منظور ملیح - دوست دارد همه کس

☆☆☆

حفظ جان از مهالک

چون زهره شیران ببرد نعره کوس برباد مده جان گرامی به فسوس
با آنکه خصومت نتوان کرد بساز دستے که بقوت نتوان برد بوس

☆☆☆

معاملت با دوست

یا همچو هماغے بر من انگن پر خویش تا بندگیت کنم بجان و سر خویش
در لایق خدمت ندانی بر خویش گو من سر خویش گیرم و کشور خویش

☆☆☆

مسائلی نیکان و بدان

همسایه که میلی طبع باشد سولش فردوس برین بود سرا در کولش
وان را که نخواهی که به بنی رولش دوزخ باشد بهشت در پهلولش

☆☆☆

حسرت جوانی در بچری

هر سرو قدے که بگردد در نظرم در بیہات او خیرہ بماند بمرم
چون من نتوانم کہ جوان گروم باز آخر کم از آنکہ در جوانان مگرم

☆☆☆

خشی صدمہ فراق

خود را بمقام شیرے دانستم چون خصم آمد بہ رویے مانستم
گفتم، من و صبر، اگر بود روز فراق چون واقعہ افتاد نتوانستم

☆☆☆

تاسف بر عمر گزشتہ

شبہا ز ہمہ خلق نہان می گریم چشم از غم دل بر آسمان می گریم
طفل از غم مرغ رفتہ چون گریہ کند بر عمر گزشتہ ہیچان می گریم

☆☆☆

انتاع از خوردہ گیری

چون ما و شما اقارب یکدگریم بہ زان نبود کہ پردہ ہم ندیم
اے خولجہ تو عیب من کن تا من نیز عیب تو مگویم کہ یک از یک تمیریم

☆☆☆

خواہش جنگ با امید معاندتہ

گر بر رگب جان زشت آید تیرم چہ خوشتر از آنکہ پیش دستت میرم
دل با تو خصومت آرزو میکندم تا صلح کنی و در کنارت گیرم

☆☆☆

حضور دوست

می آئی و لطف و کرمت می بینم و آسائش جان در قدمت می بینم
وان وقت کہ غائبی ہمت می بینم ہر جا کہ نگہ می کنم می بینم

☆☆☆

تھاشی از توبہ
گفتم کہ دگر چشم بہ دلبر نہ کنم صوفی شوم و گوش بہ مکر نہ کنم
دیدم کہ خلاف طبع موزون من است توبہ کردم کو توبہ دیگر نہ کنم

☆☆☆

دشواری مواصلت

مہ راز فلک بطرف بام آوردن و ز روم کلیسیا بشام آوردن
در وقت سحر نماز شام آوردن بتوان نتوان ترا بدام آوردن

☆☆☆

دلیل عدم وصولی الی اللہ

نہ سرو توان گفت نہ خورشید و نہ ماہ آہ از تو کہ در وصف نمی آئی آہ
ہر کس برہے میرود اندر طلبت گر رہ بتو بودے نہ بدے انہمہ راہ

☆☆☆

سیر نعدن از دوست

اے راہ روان را گزر از کوے تو نہ با بیخبر از عشق و گزر سوے تو نہ
ہر تشنہ کہ از دست تو بستاند آب از دست تو سیر گردد از روے تو نہ

☆☆☆

فراموش گردن در نصیبت

اے یار کجائی کہ در آغوش نہ و امشب بر ما نشسته چون دوش نہ
اے سرو بلند و راحت جسم و روان ہر چند کہ غائبی فراموش نہ

☆☆☆

شکایت از دیدہ دل

اے کاج نگر دے نگاہ از دیدہ بر دل نہ زدے عشق تو راہ از دیدہ
تقصیر ز دل بود گناہ از دیدہ آہ از دل و صد ہزار آہ از دیدہ

☆☆☆

طلب حمایت از دوست

روزے دو سه شد که بنده نخواستہ و اندیشہ بہ ذکر ما نہ پرداختہ
زان می ترسم کہ دشمنان اندیشند کز چشم عنایتم بینداخته

☆☆☆

دشواری ترک نظر

گفتم کہ کنم تو بہ ز صاحب نظری باشد کہ بلائے عشق گردد سپری
چندانکہ نگہ می کنم اے رھک پری بار دومین ز اولین خوب تری

☆☆☆

در بلائے عقیم از اندک ضرر رسیدن

گویند کہ دوش شنگان تتری دزدے بگرھند بھد حیلہ گری
امروز بہ آوختنش می بردند میگفت رہا کن کہ گریبان بدری

☆☆☆

عشق فطری

گیرم کہ بہ فتوائے خردمندی وراے از دائرہ شرع بدون عہم پائے
با میل کہ طبع می کند چه توان کرد بچے ست کہ درمن آفریدہ خدائے

☆☆☆

مفردات

| | |
|---|--------------------------------------|
| فرزعمان باخلف | دانی چه گفته اند بنی عوف در عرب |
| ترکب ماسوا | تو آتش بہ نے درزن و درگزر |
| زور آزمائی برضعفا | مروت نہ باشد بہ افتادہ زور |
| موافقت روزگار | خواہی کہ بہ طبعیت ہمہ کس دارد دوست |
| مستی ہدایت و ضلالت | گر راہ نمائی ہمہ عالم راہ است |
| حوادث ناگہانی | نہالے کہ سی سال گردد درخت |
| محبت ناچسب | اگر نواب در ہنگام ہم ازود کہ برانندت |
| موافقت وقت | سلطان چو بہ منزل گدایان آید |
| شان ضعفا | گر ز ہفت آسمان گزند آید |
| نسل بریدہ بہ کہ موالید بے ادب | کہ نہ خشک در پیشہ ماند نہ تر |
| بزد مرغ دون دانہ از پیش مور | باہر کہ در اوفقی چنان باش کہ دوست |
| دردست نہ گیری ہمہ عالم چاہ است | ز بخش برآرد یکے باد سخت |
| ازان بہتر کہ در پہلوئے محبوب لے نشانندت | گر بر سر بوریا نشیند شاید |
| ہمہ بر عفو دردمند آید | |

فرق در مشقت و مصیبت

| | |
|---|---|
| مصیبت آن بود کت نان نباشد | اگر دندان نباشد نان توان خورد |
| چندانکه کرم کند طمع بیش کند | خاصہ گدایان منم کہ نظر بحال درویش کند |
| نشاید کرد پیش از حد کہ ہیبت رازیان دارد | احدال در تواضع تواضع گر چه محمود است و فضل بیکران دارد |
| افسوس کہ ذلو نیز در چاه افتاد | دو گونه یاس بعد از امید کفتم کہ بر آید آبے از چاه امید |
| نظر در بخی مدار از مسافر درویش | مسافر نوازی بشکر آنکہ تو در خانہ و اہلت پیش |
| صاحب نظران را غم بیگانه و خویش | فرق در عاقل و نادان کوہ نظران را نبود جز غم خویش |
| بہ کہ ساکن دہی جواب سلام | حمل گر بلندت کسے دہد دشام |
| بیش از تو خلق دیدہ و بیش از تو بودہ ام | ناصح تجربہ کار بشو کہ من نصیحت پیران شنودہ ام |
| مطبوع نباشد دگر سے آزر دن | ولداری بر اسعد آزاری از بہر دل کسے بدست آوردن |
| کہ بد را کس نخواہد گفت نیکو | جائے جو بد گفتی مہاش ایمن ز بدگو |
| گو کفش دریدہ باش و خلقان جامہ | عالم مقلس صاحب دل و نیک ہیبت و علامہ |
| مروت است نہ چندانکہ خود فرومانی | احدال در سفا کرم بجائے فروماندگان جو بتوانی |

تفسیر مردانگی

مردی نہ بقوت است و شمشیر زنی

آنت کہ ظلمے کہ توانی نہ کنی

احکام دوستی

تو ہا ما روز و شب در باغ آنسی

خلاف است اینکه طول العہد بینی

ہدیہ ضعفا

پائے ملخے نزد سلیمان بردن

عیب است و لیکن ہنر است از مورے

صحبت ناشنودن

من سخن راست نوشتم تو اگر راست نخوانی

جرم الجلاج نباشد چو تو شطرنج ندانی

ختم کلام

کتبت لیقسی الذکر فی امم بعدی

لیا ذا الجلال اغفر لکاتبه السعدی

مطابقت و ہزلیات و مضحکات

شیخ کی کلیات کا سب سے اخیر حصہ مجموعہ ہزلیات ہے جو تیس تیس صفحہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک نہایت بدنامہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اُس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے۔ اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اس حصہ میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور پیمائی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اُس شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستان اور بوستان جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا یہی اُس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اُس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور اُن کا ہمیشہ ایک ضابطہ اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اُس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے خیالات کو ایک نادان بچہ کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا اور جب یہ صفت حد سے گزر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے۔ مگر شیخ نے اس مجموعہ کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں جو قابل لحاظ ہیں وہ لکھتا ہے کہ *الزَّمَنِي بَعْضُ أَنْبَاءِ الْمُلُوكِ أَنْ أُصْنِفَ لَهُ، بِمَا فِي الْهَزْلِ عَلَي طَرِيقِ السُّوزِنِيِّ فَلَمْ أُجِبْهُ فَهَذَا ذِي الْقَتْلِ فَلَا جَلَّ ذَلِكَ أَجَبْتُ أَمْرَهُ* و *أَنْشَدْتُ هَذِهِ الْأَبْيَاتِ وَ أَنَا أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الْعَظِيمَ*۔ یعنی ایک بادشاہ زادہ نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اُس کے لیے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں۔ میں نے نہ مانا اُس پر اُس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی۔ اس لیے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے۔ اور

میں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں۔

شیخ کا عذر جہاں تک ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا۔ تاتار سے لے کر روم و مصر و حبش تک اُس کی جولان گاہ تھی اُس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ اُس کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ گیا تھا۔ مسلمان امیر زادوں اور بادشاہوں کی صحبتوں میں لہو و لعب اور تمسخر و استہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ پس اگر کسی نالائق بادشاہ زادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سن کر اس خیال سے کہ ہمیشہ گرمی صحبت کے لیے ایک مجموعہ ہزل و فحش موجود رہے شیخ کو ان ہفتوات کے لکھنے پر مجبور کیا ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور چونکہ اس مجموعہ میں صریح فحش اور علانیہ مہکلو کے سوا باہرا اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصیت ہے بہت کم پائے جاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اُچھ اور طبیعت کی اُمنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت و کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

ایران میں ہزل و فحش کی شاعری دورہ غزنویہ کے شعرا سے برابر چلی آتی تھی اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا۔ اکثر ہاجی اور ہزال حکیم کے لقب سے ملقب ہوتے تھے اور اب تک جیسے حکیم انوری، حکیم خاقانی، حکیم شافعی، حکیم قآنی وغیرہ وغیرہ۔ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے حکیم سوزنی کہلاتا تھا۔ اس کا ہزل اور فحش انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے حکیم سنائی کی بہت سی جویں لکھی ہیں اور حکیم صاحب نے بھی باین ہمہ مشیخت و تقدس تنگ آکر اُس کے جواب میں ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھلڑ کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابوالعلائی منجوی جو منوچہر شروان شاہ کے عہد میں پایہ تخت کا ملک اشعرا تھا۔ باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مرئی اور خسر تھا اُس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق جھو بازی ہوتی تھی جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نرائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے اُس سے بالکل پاک اور مبرا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اُس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے۔

ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنقوان شباب میں جو شوخی اور بیباکی کا زمانہ ہے کسی موقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہوگی۔ اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع نہیں کرنا چاہتا۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا مگر چونکہ وہ زمرہ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا اور معتقدین کے نزدیک اُس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا اس لیے کسی بزرگوار نے اُس کی وفات کے بعد اس ناشدنی مجموعہ کو بھی تبرکاً و تہمیناً کلیات میں داخل کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستان کے مرتب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا کیونکہ اس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے۔ شیخ نے گلستان میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں۔

ہم کو بہت تجسس سے چند رباعیاں اور قطعے اس مجموعہ میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

رباعیات

انجام حسن نوخطان

آن عہد بیاد داری و دولت و داد کز عاشق بیچارہ نئے کردی یاد
انکہ بگرختی کہ کس چون تو نبود و امروز بیامدی کہ کس چون تو مہاد

اینا

آن ماہ کہ گفتی ملک رحمان ست این بار اگرش نگہ کنی شیطان ست
روے کہ چو آتش بزمستان خوش بود امروز چو پوشتین بہ تابستان ست

قطعات

تقویٰ بحرورت

چو خوشن نتواند کہ می خورد قاضی ضرورت ست کہ بردگمان بگیرد سخت
کہ گفت چہ زن از میوہ میکند پرہیز دروغ گفت۔ کہ دستش نمیرسد بہ دست

تاسف در بلائے عظیم بر قوت اعدک

مرد کے غرقہ بود در جیحون کز سمرقند بود پندارم

بانگ می کرد و زار می نالید کاسے درینا کلاه و دستارم

توبہ ضعف و پیری

حریف عمر بسر برده در فسوق و فجور بوقت مرگ پشیمان ہی خورد سوگند

کہ توبہ کردم و دیگر گنہ نخواہم کرد تو خود دگر نتوانی بریش خویش تہند

☆☆☆

عربی قصائد اور مقطعات

کلیاتِ شیخ میں میں صفحہ کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور ان کے سوا اُس کے ممتعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں۔ گلستان میں بھی جیسا کہ اُس نے خاتمہ میں تصریح کی ہے تقریباً تمام عربی اشعار اُسی کے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اُس کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیا عرب میں بسر ہوا تھا اور عربی زبان بمنزلہ مادری زبان کے ہو گئی تھی اُس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد اُس نے زیادہ تر اپنی توجہ دینیات اور تصوف اور علم ادب میں مصروف کی تھی۔ گو اُس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے مگر جس قدر ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مشاق اور ماہر ادیب کا ہونا چاہیے بایں ہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا اذعان نہیں کرتا چنانچہ بغداد کے مرثیہ میں لکھتا ہے۔

بخدا کہ میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا۔
اگرچہ میرے کلام میں وہ جادو موجود ہے
جو بائبل میں موجود تھا۔

یہاں علم اور واقفیت کی رو سے پرکھنے
والے اور عمدہ کلام کو بُرے کلام میں سے
چھانٹنے والے موجود ہیں۔

سوز دل کے سبب میرے آنسو چہرہ پر
فیک پڑے۔ سو میں نے یہ قصیدہ اس
سرگذشت کے بیان میں لکھ لیا۔

وَبِالشَّعْرِ أَيْمُ اللَّهِ لَنْتُ بِمُدَّعٍ
وَلَوْ كَانَ عِنْدِي مَا بَبَابِلَ مِنْ سِخْرِ

هَذَا لِكَ نَقَادُونَ عِلْمًا وَخُبْرَةً
وَمُنْتَجِبُوا الْقَوْلَ الْجَمِيلَ مِنَ الْهَجْرِ

جَسَرْتُ عَبْرَاتِي فَوْقَ خَدِّي كَمَا بَدَأَ
فَأَنْشَأْتُ هَذَا لِي قَصِيدَةً مَا يَجْرِي

وَلَوْ سَبَقْنِي مَسَادَةٌ جَلَّ قَدْرُهُمْ
لَمَا حَسُنْتُ مِنِّي مَجَاوِزَةَ الْقَدْرِ
اگر ذی رتبہ لوگ اس مضمون میں مجھ
سے سبقت کرتے تو البتہ مجھ کو اپنے رتبہ
سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا۔

بہر حال اُس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے نفیست ہے اور اس سے شیخ کی
شاعری کا رتبہ سوا یا بلکہ ڈیوڑھا ہو گیا ہے اب ہم اُس کے ایک طولانی قصیدہ میں سے جو کہ
اُس نے خرابی بغداد پر لکھا ہے کچھ اشعار بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

حَبْنَتْ بِحَفْنِي الْمَذَامِيعَ لَا تَجْرِي
فَلَمَّا طَفَى الْمَاءُ انْطَالَ عَلَى الشُّكْرِ
میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روکا
تھا کہ بہنے نہ پائیں پر جب پانی نے
طغیانی کی تو اُس بند کو توڑ ڈالا۔

نَسِيمُ صَبَا بَعْدَ خَرَابِهَا
تَمَنَيْتُ لَوْ كَانَتْ تَمُرٌ عَلَى قَبْرِى
يَآنُ هَلَكَ النَّفْسِ عِنْدَ أُولَى النَّهْيِ
أَحْبُّ لَهُمْ مِنْ عَيْشٍ مُقْبِضِ الصُّدْرِ
کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد
اُس کی ہوا کا جھوکا میری قبر پر گزرتا۔
کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مر جانا
تنگدل جینے سے بہتر ہے۔

رَجَزْتُ طَبِيئًا حَشًّا نَبِيئِي مُدَاوِيًا
إِلَيْكَ لَمَّا شَكُوْاى مِنْ مَرَضٍ يَبْرِي
میں نے طیبیب کو جب کہ اُس نے
علاج کے لیے میری نبض کو چھوا جھڑک
دیا کہ جا اپنا کام کر مجھ کو ایسے مرض کی
شکایت نہیں جو لہما ہو سکے۔

لَزِمْتُ اضْطِبَارًا حَيْثُ كُنْتُ مُفَارِقًا
وَهَذَا فِرَاقٌ لَا يُعَالَجُ بِالصُّبْرِ
میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر
اختیار کیا ہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا
علاج صبر سے ممکن نہیں۔

وَلَا تَسْأَلْنِ عَمَّا جَرَى يَوْمَ حَضْرِهِمْ
وَذَلِكَ مِمَّا لَيْسَ يَدْخُلُ فِي حَضْرِهِمْ
نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن
گزرا یہ وہ حال ہے جو قید بیان میں
نہیں آسکتا۔

شراب مرگ کے جام گردش میں لائے
گئے یہاں تک کہ قیدی کشتوں کے سر
تڑپتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے
گویا نشتے میں جنبش کر رہے ہیں۔

علمائے راجستھان پر جو کہ اصحاب عقل و
دانش تھے مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں
زارزار و رہی ہیں۔

اُن کے بعد دو تیس اپنی سیاہی کے
آنسوؤں سے روتی ہیں مگر بعض لوگوں
کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں۔

یہ زمانہ کے سخت حادثے ہیں کاش میں
ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم
دانشمندوں پر نہ دیکھتا۔

میں نے شہر عبادان میں ٹھہر کر درجلہ کے
پانی کو دیکھا کہ تلتر خون کی مانند سمندر کی
طرف بہتا تھا۔

میرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں
جاری ہیں خلیج فارس کے مدوجزر کو اور
بڑھا دیتے ہیں۔

فرض کرو کہ دارالخلافہ پھر آباد ہو اور علماء
کے چہرے غبارِ ذلت سے پاک کیے
جائیں۔

أَوْبَرَتْ كُؤُوسُ الْمَوْتِ حَتَّى كَانَتْ
رُءُوسَ الْأَسْرَى تَحْرُكُنْ مِنَ السُّكْمِ

بَكَتْ جُلُودُ الْمُسْتَنْصِرِيَّةِ نَهْبَةً
عَلَى الْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِينَ ذَوِي الْجَنْبِرِ

مَحَابِرُ تَبْكِي بَغْلُهُمْ بِسَوَادِهَا
وَبَعْضُ قُلُوبِ النَّاسِ أَمْلَكَ مِنْ جَنْبِرِ

نَوَائِبَ ذَهْرٍ لَيْتِيئِي مِثْ قَبْلِهَا
وَلَمْ أَرْ عُذْوَانَ السَّفِيهِ عَلَى الْجَنْبِرِ

وَقَفْتُ بِعَبَادَانَ أَرْقُبُ دِجْلَةَ
كَمِثْلِ دَمِ لِسَانِ تَبِيئِلُ إِلَى الْبَحْرِ

وَفَائِضُ دَمِجِي لِي مِصْبِيَّةٍ وَاسِطِ
يَزِيدُ عَلَى مَدِّ الْبُحَيْرَةِ وَالْجَزْرِ

وَهَبْ أَنْ دَارَ الْمُلْكِ تَرْجِعُ غَامِرًا
وَيُغْسَلُ وَجْهُ الْعَارِفِينَ عَنِ الْغَفْرِ

لیکن بنی عباس جن سے عالم کو نخر تھا جن کے اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نوارنی تھیں کہاں سے آئیں گے۔

ان کا ذکر دنیا میں ایک فسانہ ہو گیا اور یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب ہونے والا ہے جیسا کہ ابتدا سے ہی وہ غریب تھا۔

کیا وہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا ہے کہ تمام دارالاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہو گیا۔

کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائے گا اور مستعصم باللہ کا اُس میں ذکر نہ ہوگا۔

کیا اس پر صبر ہو سکتا ہے کہ مینڈک پانی کے ادھر ادھر خوشی سے کھیتے پھریں اور یونس پانی کی تہ میں ہو۔

مشتاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں اُن شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے۔

موت کا لہا لب پیالا اور جو کچھ کہ اُس میں خدا کی طرف سے اجر عظیم ہے اُن کو گوارا ہو جیو۔

فَلَيْتَن بَنُو الْعَبَّاسِ مَفْتَحُ الْوَرْدِ
ذُو الْخُلُقِ الْمَرْحِيِّ وَالْفَرِّ الْزُهْرِيِّ

عَذَا سَمْرًا بَيْنَ الْأَنَامِ حَدِيثُهُمْ
وَذَا سَمْرٌ يُدْمِي الْمَسَامِعَ كَالسَّمْرِ

وَفِي الْخَبْرِ الْمَرْوِيِّ دِينَ مُحَمَّدٍ
يَعُوذُ غَرِيبًا مِثْلَ مُنْتَدَا الْأَمْرِ

ءِ أَغْرَبُ مِنْ هَذَا يَعُوذُ كَمَا بَدَا
وَسَيِّ دَارُ السَّلْمِ فِي بَدَا الْكُفْرِ

أَتَذْكُرُ فِي أَعْلَى الْمَنَابِرِ خُطْبَةً
وَمُسْتَعْصِمٌ بِاللَّهِ لَمْ يَكُ فِي الذِّكْرِ

ضَفَادِعُ حَوْلِ الْمَاءِ تَلْعَبُ فَرَحَةً
أَصْبُرُ عَلَى هَذَا وَيُونُسُ فِي الْقَفْرِ

تَحِيَّةٌ مُشْتَقِي وَأَلْفُ نَسْرَحِمِ
عَلَى الشُّهَدَاءِ الطَّاهِرِينَ مِنَ الْوَرْدِ

هَيْنَا لَهُمْ كَمَا سِ الْمُنِيَّةِ مُنْرِعَا
وَمَا فِيهِ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ عَظِيمِ الْأَجْرِ

ہمیشہ اُن پر شام سے صبح تک زور کی قتل
گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو۔

کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے
پردہ ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے
کان بہرے ہو جاتے

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا کہ اُمتیں
سر میں خاک ڈالے ہوئے میدان حشر
کی طرف ہکائی جاتی تھیں۔

بہت لوگ فریاد کرتے تھے کہ دُہائی ہے
مردت کی کوئی مدد کرو۔ مگر باز کے پنچے
میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے۔

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کی عادی نہ
تھے اُن کے حرم محترم صحرا میں بکریوں کی
طرح ہکائے جاتے تھے۔

جو لڑکیاں پردہ میں چادروں سے
چہرے باہر نہ نکالتی تھیں اُن کے کھلے
منہ اسیر کر کے لے گئے۔

وہ کھڑی ہوتی ہیں اور چادروں اور
ٹیلوں کے ڈھلانوں میں منہ چھپاتی
ہیں مگر اُن کٹھن رستوں میں تازنیوں کی
چال کب چھپ سکتی ہے۔

اس سے پہلے میری فکر جیسی تھی تو جانتا
ہے مگر ایک ایسا امر عظیم حادثہ ہوا جو
میرے فکر کے احاطہ سے باہر ہے۔

عَلَيْهِمْ سَلَامُ اللَّهِ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ
بِمَقْتَلِ زُرَّاءِ إِلَى مَطْلَعِ الْفَجْرِ
وَلَيْتَ صُمَّاعِي صُمَّ قَبْلَ انْتِمَاعِهِ
بِهَتْكَ أَسَانِيرِ الْمُحَارِمِ فِي الْأَسْرِ

كَأَنَّ صَبَاحَ الْأَسْرِ يَوْمَ قِسَامَةِ
عَلَى أُمَّهِ شُعْبٍ تُسَاقِي إِلَى الْحَشْرِ

وَمُنْتَضِرِخٍ بِأَلْمُرُوءَةِ فَانصُرُوا
وَمَنْ يُضْرِخِ الْعُضْفُورَ بَيْنَ يَدَيْ صَفَرٍ

يُسَاقُونَ سَوَى الْمَعْرِ فِي كَيْدِ الْفَلَا
عَزَّ أَبْرَقُومٌ لَا يَبْعُودُونَ بِالزُّجْرِ

جَلْبِنَ سَبَايَا سَافِرَاتٍ وَجُوْهَهَا
كَمَا عَابُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ حُلْلِ الْخُدْرِ

تَقُومُ وَتُخْفُوا فِي الْمَعَاجِرِ وَاللَّوِي
وَهَلْ يَخْتَفِي مَشَى النَّوَاعِمِ فِي الْوَعْرِ

لَقَدْ كَانَ فِكْرِي قَبْلَ ذَلِكَ مَا تَرَى
فَأُخِدْتُ أَمْرًا لَا يُحِيطُ بِهِ فِكْرِي

زمانہ کی گردش اور حکومت کے سامنے
شہنشاہوں اور داناؤں کے ہاتھ
بندھے ہوئے ہیں۔

خدا کی پناہ ہے قند کی اُس آگ سے جو
دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب
تک بھڑکتی چلی گئی۔

خراسان سے ایک غبار نمودار ہو کر بلند
ہوا اور ایک گھٹنگھور گھٹنا بن گئی جو چاند پر
سے ہٹنے والی نہ تھی۔

خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو دولت
بنی عباس کے بعد خواب غفلت سے
بیدار ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو
کے لیے تازیانہ ہے۔

خدائے بے نیاز و یگانہ کے ملک کے سوا
ہر ملک اور سلطنت کے پیچھے اُس کا
زوال لگا ہوا ہے۔

جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں
کچھ فرق نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبر کی
نگاہ سے مت دیکھ۔

کتے کی طرح معشوقہ دنیا کی ہتیلیاں
تو نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن
اُس کے ناخن تیز ہیں۔

وَبَيْنَ يَدَيَّ صَرْفِ الزَّمَانِ وَ حُكْمِهِ
مُغْلَلَةٌ أَيْدِي الْقِيَاصِرِ وَالْحَجَرِ

نُعُوذُ بِعَفْوِ اللَّهِ مِنْ نَارِ فِتْنَةٍ
تَأْجِجُ مِنْ قَطْرِ الْبِلَادِ إِلَى الْقَطْرِ

بَدَأَ وَ تَعَالَى مِنْ خُرَاسَانَ قَسَطُ
فَعَادَ رُكَّامًا لَا يَزُولُ عَنِ الْبَدْرِ

رَعَى اللَّهُ إِنْسَانًا يَتَّقُهُ بَعْدَهُمْ
لِأَنَّ مُصَابَ الزَّيْدِ مُزْجَرَةٌ الْعَمْرُو

وَسَائِرُ مُلْكٍ يَفْتَقِيهِ زَوَالُهُ
سِوَى مَلَكُوتِ الْقَائِمِ الضَّمْدِ الْوَتْرِ

إِذَا كَانَ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا فَرْقَ بَيْنَنَا
فَلَا تَنْظُرَنَّ النَّاسَ بِالنَّظْرِ الشُّرْبِ

وَجَارِيَةِ اللَّئِيمِ نَعْوَمَةٌ كَفَيْهَا
مُحِبَّةٌ لِكِنَّهَا الْكَلْبُ ذُو الظَّفْرِ

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا
تو البتہ بڑائی اور تکبر کرنے کا مستحق تھا۔
اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا نفع
اٹھا لیا ورنہ کچھ شک نہیں کہ تو ٹوٹنے
میں رہا۔

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا
آدمی کے لیے ننگ کی بات ہے مگر اے
غافل تو اُلٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا
ہے۔

خدا تعالیٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف
فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر
ہم پر احسان کرے۔

وَلَوْ أَنَّ ذَمَّالٍ مِنَ الْعَوَاتِ خَالِيًا
لَكُنَّا جَدِيدًا بِالسَّعَاطِمِ وَالْكَبِيرِ
رُبِحْتَ الْهُدَىٰ إِنْ كُنْتَ عَامِلًا صَالِحًا
وَإِنْ لَمْ تَكُنْ وَالْعَضْرُوبَةُ لَفِي خُسْرٍ
عَلَى الْمَرْءِ عَارُ كَثْرَةِ الْمَالِ بَعْدَهُ
وَإِنَّكَ يَا مَغْرُورٌ تَجْمَعُ لِلْفَخْرِ

غَفَا اللَّهُ عَنَّا مَا مَضَىٰ مِنْ جَرِيْمَةٍ
وَمَنْ عَلَيْنَا بِالْجَمِيلِ مِنَ الشَّرِّ

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے قوی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس کے قریب عمر پائی۔

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات جگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی۔

اُس کا مذہب جیسا کہ خود اُس کے کلام سے ظاہر ہے تسنن معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت تشیع کا گمان کیا گیا ہے اُس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں شیعہ لکھا ہے۔ ہم اُس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دے کر ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصب تھا اور یہی اُس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا مگر آج کل کے مشائخ اور داعیین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈلا، یار باش، ہنسوز، ظریف، ریا اور نمائش سے دور سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بے تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں

جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں کی بھٹکی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ بایں ہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جاسکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اُس کی سفارش سے جیسا کہ گلستان کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔ خودداری اور غیرت اُس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالیٰ نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی اُس کے نصاب اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جو ہر فطری دوسرے زمانہ کے ایسے اتفاقات جو اُس کے جلا کا باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا جہاں ہونہار بچوں کو خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے۔ یتیمی اور بے پردی اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور اہتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بیکسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں۔ جس مدرسہ میں وہ حسن اتفاق سے تحصیل کے لیے پہنچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربراہ آورده تھا اور جس دار الخلافہ میں وہ مدرسہ واقع تھا وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شاہد اور مہذب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا بلکہ زمانہ نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی عمر کا ایک

بہت بڑا اور مفید حصہ نہایت کٹھن اور دور دراز سفر کرنے اور دنیا کی عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات، ظالم بادشاہوں اور بے رحم عالموں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دل سوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے ایک بار جیسا کہ گلستان میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستائی زادے وزارت کے درجہ کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے عجیب و غریب تماشے اس کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطین کر دیہ کا خاندان جن کی سعادت و جلالت، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی اسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجھ، تونیزہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا۔ اسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت بحیرہ خرز اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی اسی صدی میں تاتاریوں^۱ کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہوئی اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستان اور بوستان میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب و صاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا دار الملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقہ اسمعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور و شور کے ساتھ حکمران رہا ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور گردوں نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقایع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی

1۔ اس معرکہ میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصاد العباد کے دیباچہ میں لکھا ہے تاتاریوں نے صرف رے اور اُس کے گرد و نواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے اور خراسان کے چار شہر بلخ، مرو، ہرات اور خیساپور بالکل تاراج اور نابود ہو گئے اور اُن کے دائیں بائیں اکثر بستیاں قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں۔

بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے اُس میں کہتا ہے۔

رَعَى اللّٰهَ اِنْسَانًا تَيْقُظُ بَعْدَ هُمْ لَانَ مُصَابِ الزَّيْدِ مُزَجْرَةَ الْعَمْرُو
یعنی: خدا حمایت کرے اس شخص کی جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے۔ یورپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے کہ میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسہ روزگار میں پائی ہے جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز استاد تھے۔

اس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسر آتی ہیں۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالہ¹ میں اُس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ عالم سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علماء، صلحا، مشائخ اور کالمین سے ضرور ملتا تھا۔ صاحب نجات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانشمندیوں اور عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بوستان میں لکھتا ہے۔

تمتع ز ہر گوشہ یافتم ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی بلاد اسلام میں ایک جم غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علماء و حکماء کا نظر آتا تھا۔ خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے جیسے ایران، روم، شام، عراق، عرب اور مصر وغیرہ وہ اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا اُن میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقق ایسے موجود تھے جو تمام بلاد اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدین ابن العربی، خواجہ نصیر الدین

طوسی، شیخ صدرالدین قونوی، مولانا جلال الدین رومی، ابن تمیمیہ حرآنی، امام یافعی، شیخ ابوالحسن شاذلی، شیخ تاج الدین قسطلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ابن قارض، شیخ اوحد الدین کرمانی، قاضی ابن خلکان شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح، خواجہ علاء الدین سنائی، علامہ قطب الدین شیرازی، امام محی الدین نووی، قاضی ناصر الدین بیضاوی ابن عسا کر فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے سینکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزرے تھے اور ان کے علاوہ جیسا کہ گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے وہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔ اسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا اور کبھی وہ احرار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش والو اط کے جلسوں کا تماشا شائی تھا۔ نہ اُس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا نہ بت خانے میں رہنے سے ننگ تھا۔ اسی نے جامع بھلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا اور وہی بت خانہ سومنات میں ایک مدت تک پجاری رہا۔ کبھی وہ بصرہ کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا۔ غرض کہ اُس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اسکو گریٹ مورلٹ کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھج سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعراے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہر اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے اس نے ایک سو بیس (120) برس اس قفس عنصری میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بڑھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے اگرچہ شیخوخت کے مرتبہ کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی۔ لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے کمال کو پہنچتی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ ان کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجہ کی تھی مگر ان کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عرفی شیرازی کی نسبت

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے ”غنچہ استعدادش تا کثافتہ ماند“ ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پروازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک اُلھو پچھیرا جس کی بھاگ دوڑ اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے اور ایک معمر سن رسیدہ شاعر گو اُس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو اُس شایستہ اور سدھ منی گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اٹھاتا الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خدائے تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت و واقعہ پر نہ کہ محض اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نرالاپن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں۔ کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم و بیش اُس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے۔ ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا جیسے چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن اُن کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے جیسے خواجہ حافظ شیرازی کی غزل۔ اس لیے ہم اُن کو شیخ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔

شیخ کو اور شعرا پر اس سبب سے بہت بڑی فوقیت ہے کہ اِس کی نظم و نثر دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلم الثبوت شعرا گزرے ہیں اُن میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو۔ اگرچہ ہندستان میں نور الدین ظہوری کو بھی نظم و نثر کا جامع مانتے ہیں لیکن اہل ایران اُس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بیشک اُس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النظر میں نہایت دل فریب ہیں جیسے۔

سنبلی خرفش از آہ ناخکیبان بنفشہ نقطہ اش از خالی دلفریبان

”از شیخ طراوت کلمات نہر سطر مالال آب حیاتِ حضرت شنبہ سیرابی ادا میجا
 مردہ جان بخشی ہوا نکتہ ہاے برجستہ غنچہ ہاے سربستہ۔ نثرش نثرہ رفعت۔
 شعرش شعری مرتبت ہر صفحہ چمنے و ہر سطرے نخلے برگش لفظ دلکش و بارش معنی
 بے غش ہر خوش فصلے و ہر فرعش اصلے“ اسی طرح سے نثر کے اور بہت سے
 فقرے الفاظ پرستوں کو نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں الفاظ کے
 سوا اور کچھ بھی نہیں۔

خوب اند و خوش اند و بوند ارند

بخلاف اس کے شیخ نے گلستان میں اس سے بہت زیادہ دلآویز و دلکش الفاظ میں
 حقائق و اقیعہ کو بیان کیا ہے یہ بات گلستان کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی۔
 مثلاً ”در ایام جوانی چنانکہ افتد و دانی، نظرے داشتہ بہ روے و گزرے داشتہ بہ کوے،
 (2) اے برادر حرم در پیش و حرامیان از پس اگر رفتی بردی و اگر رفتی مردی (3) آزر دن دل
 دوستان جہل ست و کفارہ بیمین اہل (4) تو کہ چراغ نہ بینی چراغ چہ بینی (5) طریق
 درویشان ذکر ست و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمل۔ ہر کہ
 بدین صفحا موصوف است بحقیقت درویش ست۔ اگر چہ در قبا است۔ اما ہرزہ گردے
 بے نمازے ہوا پرستے ہوس بازے کہ روز ہا بہ شب آرد در بند شہوت و شبہا روز کند در خواب
 غفلت و بخورد ہر چہ در میان آید و بگوید انچہ بر زبان آید زندیق ست اگر چہ در عبا ست
 (6) پدرا عمل بسیار است اما پسر گرمی دار ست (7) صیاد بے روزی درد جلد ماہی نگیرد و
 ماہی بے اجل بر خشکی نمیرد (8) گوئی خردہ مینا بر خاکش ریختہ و عقد ثریا از تاکش در آویختہ
 (9) عصارہ تا کے بقدرش شہد فائق شدہ و تخم خرما بہ یمن تریتش نخل باسق گشتہ۔“

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں نادر الوجود نہیں ہیں بلکہ ہر زبان میں یہی حال
 ہے اگر یزی میں باوجود یکہ لٹریچر کی ترقی انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ہے صرف کنتی کے آدمی
 ایسے ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہل فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے بعضے ملٹن
 کو اور بعضے مسکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں، پس شیخ
 کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اسی کی نظم و نثر ایسی ہیں جن کو تمام

اہل زبان نے تسلیم کیا ہے۔

شیخ نے بھی تعزّل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعراے ایران کی طرح امردوں اور سادہ رخنوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے حقیقت میں ایسی نہیں ہے اور صرف اسی بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعرا پر امرد پرستی کا الزام لگانا بیجا ہے۔ فارسی زبان میں اور اُس کی پیروی سے اردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت، رند ہو یا صوفی، خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اُس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت۔ دنیا دار ہو یا تارک دنیا، عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اُس کا معشوق مرد ہے۔ اس طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اُس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی کی غزلوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رُخ لڑکے پر مفتون ہیں اور اُن کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطرب و بیقرار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقتِ واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھنا نہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بوتلی سونگھی صد ہا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں پاکباز اور صاحبِ عقبت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں۔ البتہ اس سے شرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے۔ جس کے اصول اور فروع سب تصنع اور بناوٹ اور ادعائے محض پر مبنی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی اور مولانا روم اور امیر خسرو

اور خواجہ حافظ اور تمام شعرائے متصوفین اس سے متشبیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیراے میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعہ بیان کرتے ہیں۔ بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شاہد کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شاہد حقیقی کے شیون و صفات مراد لینی صرف ایک ملا یا نہ گھڑت ہے جس میں سراسر تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوچہ شاعری سے نابلد ہیں۔ کنا یہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے چنانچہ حضرت مولانا روم مشنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

شعرائے متصوفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو ان میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نجات الانس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیات متصوفانہ اشعار میں مشہور ہے ان کے سامنے کسی نے ان کے معاصر شیخ کمال السعلیل بخمدی کا یہ مطلع پڑھا۔

چشم اگر این است ابرو این و ناز و عشوہ این الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے عقل و دین

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضروری ہے جو معنی مجازی کے سوا کوئی اور محل نہ رکھتا ہو۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مراد لفظ ہیں پس عین سے ذات الہی مراد لی جاسکتی ہے اور ابرو حاجب کا مراد لفظ ہے پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفات الہی جو کہ حاجب ذات میں مراد لی جائیں۔ مولانا نے اس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی خواجہ حافظ کی نسبت اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ”یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے اس نے اکثر اسرار نبوی اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا“ پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوان حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تغزل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شیرازی کے تتبع

سے حاصل کیا ہے۔

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انھوں نے تغزل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں اور یہ دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں۔ مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اُس سے وصل کا طالب اور کا مجو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرت انسانی بالکل ابا کرتی ہے ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے۔ اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں۔ پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعر اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق و معشوق دونوں مرد فرض کیے جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ تھوڑا ہی سا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اس کے کہ ان کے ہاں عورتوں کا مردوں سے چھپانا مذہبی فرائض میں سے تھا غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں ان کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں اس غیرت کا ظہور سب طبقات سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیئر فرانسسیسی جو ہندستان میں پندرہ سولہ برس عالمگیر کے ساتھ رہا اپنے واقع میں لکھتا ہے 'ہندستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی تنفس اگرچہ کیسا ہی ذی رتبہ اور صاحب اختیار ہونہیں جانے پاتا تھا ورنہ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا اور ایران میں سنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہر یا گانوں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے' شاید اس بیان

میں کچھ مبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مداح اور مصاحب ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعرا نے غزل اور تہییب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر اور جو جو معاملات عشق کے زمانہ میں عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں ان کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی حمیت اور غیرت کے برخلاف سمجھا ہوا اور اس لیے تمام عشقیہ مضامین مردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھالے گئے ہوں۔ سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی غزل گارہا تھا اور بادشاہ اُس کو سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ شعر گایا۔

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بُو دی امشب کہ ہنوز چشم مست اثرِ خمار دارد
 بادشاہ دفعتاً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً ملا نقشی مہر کن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھیمیا کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا حضور خیر باشد۔ بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے عزتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندستان میں نشوونما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندستان کے اصول کے موافق اشعار کہتے تھے یہ شعر بھی انہوں نے اسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا۔ اور پھر گانا بجاتا ہونے لگا۔

اگرچہ شیخ یا اور شعرا نے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ان کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستان کے

پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اُس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں اُس کو سادہ رُخوں اور مردوں کی طرف میلان خاطر رہا ہے۔ مگر اس بات کو میں کسی بُرے معنی پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو تفحّات وغیرہ میں لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقی باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عرفاء میں یہ خصلت پاکدامنی اور عفت کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے اُسی طرح ناپاک عشق بازاری اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی براءت بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے۔

گر نظر صدق را نام گنہ می نہند حاصل ما بیچ نیست جز گنہ اندوختن

تمت بالخیر

